جلد ۱۰۶ فروری ۱۹۸۷ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

ڈاکٹر ملک غلام مُرتضیٰ اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبہ ترجمہ

اِسلامک یونیورسٹی مدینہ منوّرہ

کی

تصانیف

- وجودِ باری تعالیٰ اور توحید — ۶۰/- روپے
- رسولِ اکرمؐ کی شادیاں اور ان کا پس منظر — ۸/- ″
- مقصدِ حیات اور اُس کا حصول — ۸/- ″
- جرائم کے اسباب (ایک نفسیاتی تجزیہ) — ۶/- ″
- نشہ اور اُس کا حتمی علاج (ایک نفسیاتی جائزہ اور عملی تدابیر) — ۶/- ″
- حقیقتِ دُعا — ۹/- ″
- توبہ کی حقیقت — ۶/- ″
- احیائے دین کی اساس — ۸/- ″
- اسلام اور محمدؐ پر بہتانات (عربی) (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں جہالت اور بغض پر مبنی ۲۴ الزامات اور غلط بیانیوں کا مدلل جواب) — ۲۰/- ″
- ″ ″ ″ ″ (اُردو) — ۲۰/- ″
- ″ ″ ″ ″ (انگلش) — ۲۰/- ″

ملنے کا پتہ

اِدارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ - رحمان مارکیٹ - غزنی سٹریٹ - اُردو بازار لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۶ | فروری ۱۹۸۷ء مطابق جمادی الاُخریٰ ۱۴۰۷ھ | عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

وفیات

از جدائیہا شکایت می کند

(مدیر)

پروفیسر اکرم جلیلی مرحوم کا رابطہ تحریک سے پٹھانکوٹ میں استوار ہوا جہاں وہ مولانا سے ملنے گئے۔ ریلوے گارڈ تھے۔ امرتسر میں حاجی بشیر صاحب کی امارت میں جماعت کی رکنیت قبول کی۔ پھر وہاں ہی مہاجرین کے قافلوں کے تحفظ و امداد کے لیے کیمپوں میں کام کیا۔ "امرتسر جل رہا تھا" میں ان کا ذکر ہے، مگر لفظ "جلیلی" ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے شخصیت مبہم رہ گئی ہے۔ والٹن کیمپ میں بھی خدمتِ مہاجرین کی۔ ایک مرتبہ سال بھر کے لیے جماعت شہر لاہور کے قیم بھی رہے۔

ادبی لحاظ سے ترجمہ کرنے کا رجحان زیادہ تھا۔ انہوں نے ایک ناول "اخناتون" کا ترجمہ کئی سال پہلے کیا۔ یہ توحید پرست فرعون تھا۔ اسلامی جرائد میں ان کے بہت سے تراجم چھپتے رہے۔ وہ یادداشتیں بھی مرتب کر رہے تھے۔ مکتبہ المنار کے لیے فلپائنی مسلمانوں کے متعلق "بنگسامورو" کا ترجمہ کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر سعید رمضان کی قانون پر لکھی ہوئی کتاب کا ترجمہ کیا۔

دوست نوازی، خاموشی، حلم، صبر ان کی طبیعت کے نمایاں پہلو تھے اور یہی خوبیاں تھیں کہ وہ انتہائی کربناک تکلیف کو بڑی جگرداری سے برداشت کرتے رہے۔ تا آنکہ اللہ کے حکمِ رحلت نے انہیں نجات دلا دی۔ خدا ان کی مغفرت

فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو خیر و خوبی سے نوازے۔

○

ترجمان القرآن کا نام آتے ہی سب سے پہلے اگر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نام یاد آتا ہے تو یادوں کا یہ سلسلہ منشی محمد صدیق (شاگرد الماس رقم) مرحوم تک جا پہنچتا ہے۔ برسوں ترجمان القرآن کی کتابت کی۔ تفہیمات اور دوسری کتابیں قلم سے گذریں اور پھر سیرتِ سرورِ عالم میں اپنے فن کا حصہ شامل کیا۔ یہاں تک کہ وہ کہتے کہ میں ان چیزوں کو لکھتے لکھتے خود عالم ہو گیا ہوں۔ مولانا بھی ان کے بہت قدردان تھے اور اچھے فن کے لیے اچھی نگاہِ تحسین رکھتے تھے۔

فنِ نستعلیق کے استاذ الاساتذہ پروین رقم تھے، پھر یہ رنگ کچھ زرّین رقم کے حصے میں گیا، کچھ مجید رقم کی طرف، مگر پورے زور سے اسے محمد صدیق الماس رقم نے اپنایا اور اسے ترقی دی۔ انہی محمد صدیق استاذ کی شاگردی ہمارے مرحوم محمد صدیق نے کی اور رہم نامی کی برکت نے بھی اپنا کام کیا۔

راقم سے بڑی محبت رہی۔ ترجمان میں میں کچھ لکھتا، یا پوسٹر بناتا تو بڑی تعریف کرتے، اور اگر کسی آیت یا حدیث کے لکھنے میں غلطی کر جاتا تو خود ہی اصلاح بھی اصلاح کر دیتے اور مجھے آگاہ کرتے۔

اللہ ان کی رُوح پر رحمتیں نازل فرمائے اور ان کے اہلِ خانہ پر سایۂ برکت و سعادت رکھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس مرتبہ ہم اشارات کے صفحات میں ایک ایسے مضمون کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو بھارتی مسلمانوں کو اپنے دینی و تہذیبی تشخص کے سلسلے میں پیش آنے والی سنگین آزمائش کا آئینہ دار ہے۔ شاید سیکولرازم کی فتنہ سامانیوں اور خصوصاً بھارت میں اس کے بدترین فرقہ پرستانہ استعمال سے اہل پاکستان عبرت پذیر ہو سکیں۔

(مدیر)

بھارت میں مسٹر نرسمہاراؤ کی سرکردگی میں یکساں سول کوڈ بل (UNIFORM CIVIL CODE BILL) کا ڈرافٹ تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ اسے پارلیمنٹ کے آئندہ بجٹ سیشن میں پیش کیا جائے گا۔ ہندو اکثریت کا مشورہ ہے کہ مسلمان اسے جوں کا توں تسلیم کر لیں اور اس کی مخالفت چھوڑ دیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلم خواتین ایکٹ (طلاق کے بعد حقوق کی حفاظت کا ایکٹ، مجریہ مئی ۱۹۸۶ء) کے بعد مسلمانوں کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ "غیر متعلقہ معاملات" کے بارے میں اپنی مخالفت کا اظہار کرتے پھریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کا یہ مشورہ غیر منطقی اور نامناسب ہے۔ مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ دستور کے آرٹیکل نمبر ۴۴ کو منسوخ کر دیا جائے یا پھر مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ مجوزہ نیا رہنما اصول (DIRECTIVE PRINCIPLE) آئین کی دفعہ ۲۵ سے متصادم ہے۔ جس میں ضمیر و مذہب کی آزادی دی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہٹ دھرم ہندوؤں کو اس کی مطلق پروا نہیں ہے۔

پارلیمنٹ نے "یکساں سول کوڈ" منظور کر لیا تو اس سے بھارت میں بسنے والے کروڑوں مسلمان متاثر ہوں گے۔ اس سے مسلمانوں کی علیحدہ شناخت ختم ہو جائے گی۔ شادی بیاہ، طلاق، نان نفقہ، بچوں کی تعلیم و تربیت اور ولایت و حضانت جیسے اہم معاملات مجوزہ بل کے ذریعے طے ہونے لگے تو مسلم معاشرے پر اس کے دُور رس اور منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ بوالعجبی دیکھیے کہ ایک مرد اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد بھی اس قانون کی رُو سے اسے عمر بھر نان و نفقہ دینے کا پابند ہوگا۔ ایک اور کلاز میں یہ بھی درج ہے کہ بیوی اپنے خاوند سے قطعِ تعلق کر سکے گی اور اس حالت میں بھی نان نفقہ لینے کی حقدار ہوگی۔ بیوی اگر محسوس کرے کہ اس کا خاوند کسی مہلک اور خطرناک بیماری میں مبتلا ہے تو وہ اُسے گھر ہی میں چھوڑ کر خیرباد کہہ سکے گی۔

اب ہم اس بل کے بعض اہم نکات پر قدرے تفصیل سے نظر ڈالتے ہیں۔ اس بل کی سب سے بڑی "خصوصیت" یہ ہے کہ یہ جائز اور ناجائز اولاد دونوں کو یکساں تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد دوسری شادی یا منگنی کے "جرم" کا ارتکاب کرنے والے کو سزا دی جا سکے گی۔ اس بل میں بوڑھے اور اپاہج والدین کو "تحفظ" کی ضمانت دی گئی ہے، مگر اس کی تشریح کہیں موجود نہیں ہے۔

اکتوبر ۱۹۸۶ء میں بار کونسل آف انڈیا کے ایماء پر "یکساں سول کوڈ" کے موضوع پر ایک قومی کنونشن منعقد ہوا تھا۔ اس میں اقلیتی مذاہب کے نمائندے نہ ہونے کے برابر تھے۔ ہندوؤں کی یہ ایک سوچی سمجھی چال تھی۔ اس سلسلے میں آپ نرا جا چودھری کا وہ مضمون پڑھ سکتے ہیں، جو اخبار سٹیٹسمین میں ۱۰ر نومبر ۱۹۸۶ء کو چھپا تھا۔

یہ بات ہندو بھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے شادی بیاہ، نکاح، طلاق، وراثت اور نابالغوں کی سرپرستی کے اپنے الگ قوانین پہلے سے موجود ہیں اور ان پر سینکڑوں برس سے عمل ہو رہا ہے۔ ان قوانین کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔ اگر کوئی مسلمان ان شرعی قوانین کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے قانون کو اپناتا ہے تو وہ اُسی وقت دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ "یکساں سول کوڈ" اگرچہ "تجرباتی" اور "رضاکارانہ" بنیاد پر لاگو ہو رہا ہے، لیکن درحقیقت یہ اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش ہے۔ ہندو اس کے ذریعے اسلام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر تمام اسلامیانِ ہند کو

بے دین بنا دینا چاہتے ہیں۔ ماضی قریب میں اس کی تمہید باندھی جا چکی ہے۔ اپریل ۱۹۸۵ء میں مشہور شاہ بانو کیس کے فیصلے کے خلاف مسلمانوں نے متحدہ موقف پیش کیا تو ہندو اکثریت بوکھلا اٹھی۔ ہندوؤں کی مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی تنظیموں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ ان میں آر ایس ایس، بی جے پی، جنتا، لوک دل، ڈی ایم کے، ٹیلگو ڈیسام، کمیونسٹ مارکسٹ اور ان کی حواری تنظیمیں آگے آگے تھیں۔ انسانیت کے یہ "ہمدرد" مسلم خواتین کی "حالتِ زار" پر تو کلبلا رہے تھے لیکن مراد آباد اور احمد آباد کی بیواؤں اور ان یتیم بچوں کے لیے ان کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھے جن کے سہاگ اور سہارے ہندو بلوائیوں نے لوٹ لیے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت میں فسادات کے ساتھ ساتھ پارلیمانی اور نام نہاد عدالتی فیصلوں کے ذریعے مسلمانوں کو نابود کرنے کی ناپاک جسارت کی جارہی ہے۔ ہندوؤں کا جنون اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ سپریم کورٹ بار کونسل کے کنونشن میں اس کے چیئرمین وی سی مشرا نے تقریر کرتے ہوئے علی الاعلان دھمکی دی کہ "یکساں سول کوڈ" کے نفاذ کے لیے "خانہ جنگی" سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا۔ ہندو پروہت بھی مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں آگے آگے ہیں۔ ۷ رنومبر کو مدراس میں سری ابھینا وا ودیا اور شنکر آچاریہ سری نگری نے صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ متحدہ بھارت میں دو مختلف قانون نہیں ہونے چاہئیں۔ ان کے بقول "ملک میں ایک ہی قانون لاگو ہونا چاہیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مذہبی حد بندیاں مٹ جائیں گی۔ ہندو، مسلم اور عیسائی کی پہچان نہیں رہے گی۔ ہر فرد اول و آخر بھارتی ہوگا"۔ غضب یہ ہے کہ ہندو سوچ سے عدالت عالیہ بھی مبرا نہیں۔ شاہ بانو کیس میں مسٹر وائی وی چندر اشاد کی یہ رائے ریکارڈ پر موجود ہے کہ "مقدمے کے دوران جج صاحبان "قومی سالمیت" پر سب سے زیادہ زور دیتے رہے"۔ اس میں شک نہیں کہ بھارت میں بسنے والے مسلمان بھی قومی سالمیت کے قائل ہیں، لیکن ہندو اس کی آڑ میں اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں تو یہ مسلمانوں کے ساتھ صریح بے انصافی ہوگی۔

دائیں یا بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی ہندو تنظیمیں "قومی سالمیت" کی دہائی دے کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتی رہتی ہیں۔ وہ ڈھٹائی سے جو کچھ کہنا چاہتی ہیں، کہتی پھریں۔ مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں "بھارتی مسلمان" کے طور پر اپنی شناخت و تشخص برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ ہندو اپنی شناخت چھوڑنے پر تیار نہیں تو مسلمان کو ایسا کرنے پر مجبور کیوں کیا جاتا ہے؟ کیا یہ توہین آمیز اور

ظالمانہ رویہ نہیں ہے۔

ہندو اپنے بھارتی مسلمانوں کو گمراہ کن دلائل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "دنیائے اسلام" مسلم پرسنل لاء "تبدیل کر چکی ہے۔ اس لیے انہیں بھی اس قانون پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ معلوم نہیں کہ وہ کون سا ملک ہے جس کا یہ حوالہ دے کر اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہیں۔ ان اسلامی ملکوں نے اپنے یہودیوں، عیسائیوں، بدھوں، ہندوؤں، بہائیوں اور قادیانیوں کو اپنے پرسنل لاز تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا، چہ جائیکہ وہ مسلم پرسنل لا میں تحریف کرتے۔ ہم ترکی اور البانیہ کی وکالت نہیں کر سکتے۔ سب جانتے ہیں کہ مصطفےٰ کمال اتاترک لادینی نظامِ حیات کا پیروکار تھا۔[1] اقتدار میں آنے کے فوراً بعد اُس نے ملک میں رائج تمام اسلامی قانون منسوخ کر دیے۔ اتاترک کے حکم پر "سوئس سول کوڈ" کا نفاذ عمل میں آیا جو سراسر لادینیت پر مبنی تھا۔ اِس سلسلے میں ترکی کی مثال قطعی بے محل ہے۔ اسلام کے بارے میں اتاترک کا اپنا رویہ انتہائی جارحانہ تھا۔ اس نے اسلامی اقدار کو ملیامیٹ کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑی، لیکن آج وہی ترکی ہے جہاں اب اسلامی نظامِ حیات اپنانے کی تحریک دوبارہ شدّومد سے چل نکلی ہے۔ جہاں تک البانیہ کا تعلق ہے تو وہ ایک ملحد اشتراکی ملک ہے۔ اس کا اسلام یا کسی اور مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں کئی انقلاب آئے، سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں، لیکن پرسنل لا جوں کا توں رہا۔ ۱۹۶۱ء سے البتہ چند انتظامی اصلاحات نافذ ہیں۔ اِن میں شادی کی رجسٹریشن، دوسری شادی کے لیے مصالحتی کونسل کی اجازت، طلاق سے پہلے مصالحتی کونسل سے رجوع اور یتیم پوتے کی وراثت کا تعین سرفہرست ہیں۔ دراصل اس بل کا مقصد مرد کے بے جا اختیارات کو کم کرنے کے

---

[1] یہ پس منظر بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جدید ترکی کا ظہور یہودیوں کی سازشوں کے تاسیسی سائے میں ہوا تھا اور پھر خفیہ یہودیت نے دونمہ تحریک کی شکل اختیار کر کے مسلم معاشرے اور حکومت اور انقلابی تنظیم میں نفوذ حاصل کر لیا۔ اور مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے انہیں جارحانہ لادینیت کا شکار بنایا۔ لہٰذا ترکی کی نظیر ایک معتدل صحت مندانہ نظیر نہیں ہے۔ (مدیر)

سوا کچھ نہیں۔[1]

مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک تمام مسلم ممالک اسلامی قوانین پر عمل کرتے ہیں۔ یہ بات باعثِ فخر ہے کہ ان ملکوں نے اقلیت کے پرسنل لاء کو کبھی نہیں چھیڑا۔

بھارت میں "قانونِ وراثت ۱۹۲۵ء" اور "اسپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ء" پہلے ہی سے نافذ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یکساں سول کوڈ کی منظوری کے بعد انہیں نئے جاری ہونے والے ضابطوں میں مدغم کر دیا جائے گا۔ مذکورہ قانونِ وراثت کے تحت جائیداد کی وصیت پر کوئی حدود و قیود نہیں۔ اس کی دفعہ نمبر ۵۹ کے تحت مکمل جائیداد وصیت کے ذریعے کسی بھی دی جا سکتی ہے۔ وصیت نہ ہونے کی صورت میں بیوہ ایک تہائی اور بچے دو تہائی جائیداد کے وارث بنتے ہیں۔ اولاد نہ ہونے کی صورت میں متوفی کی بیوہ اور رشتہ دار جائیداد کے مساوی وارث شمار ہوتے ہیں۔ اگر بیوی فوت ہو چکی ہے تو پھر متوفی کی جائیداد اس کے بچوں میں تقسیم ہوگی۔ اسی طرح خاوند متوفیہ بیوی کی جائیداد مساوی بنیاد پر (یعنی بیوہ کے حق کے برابر) لے سکے گا۔ صاحبِ اولاد نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنی بیوہ کی پوری جائیداد کا مالک ہوگا۔

اِدھر اسپیشل میرج ایکٹ مسلمانوں کے تشخص پر ایک زبردست وار ہے۔ اس ایکٹ کے تحت پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی سزا سات سال قید بامشقت مقرر کی گئی ہے۔ چچا اور ماموں کے گھرانے میں شادی منع ہے۔ طلاق عدالت کے حکم کے بغیر واقع نہیں ہو سکتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ شادی کے بعد تین سال تک طلاق کی درخواست نہیں دی جا سکتی۔ اگر اس کے بعد عدالتی فیصلے سے طلاق ہو جائے تو طلاق دہندہ کو ایک سال گزارنے کے بعد نئی شادی کی اجازت ملتی ہے۔ سابق خاوند کے لیے لازم ہے کہ وہ مطلقہ بیوی کو نان نفقہ فراہم کرتا رہے تاوقتیکہ وہ (مطلقہ) دوسری شادی کر لے یا انتقال کر جائے۔

یہ لادینی قانون اور ضابطے اب یکجا کر کے "یکساں سول کوڈ" کا حصہ بنا دیے گئے ہیں۔ ہندو اربابِ اختیار کو مسلمانوں کے احساسات و جذبات کی مطلق پروا نہیں ہے۔ وہ یکساں سول کوڈ جیسے کالے قانون کے نفاذ پر تلے بیٹھے ہیں۔ مسلمانوں کا اپنا پرسنل لاء پہلے سے موجود ہے۔ انہیں اس سلسلے میں کسی نئے ضابطے کی ضرورت نہیں۔ مسلم پرسنل لاء

---

[1] اس سلسلے میں فاضل مضمون نگار کا تجزیہ درست نہیں اور ان عائلی قوانین کو تمام مسالک کے علماء متفقہ طور پر مسترد کر چکے ہیں۔ (مترجم)

کی رُو سے ایک تہائی جائیداد تک کی وصیت حسبِ مرضی کی جاسکتی ہے۔ باپ کی جائیداد سے بیٹی کو بیٹے کے مقابلے میں آدھا حصہ ملتا ہے۔ صاحبِ اولاد ماں کو اس کے خاوند کی جائیداد کا آٹھواں اور بے اولاد ماں کو ایک چوتھائی ملتا ہے۔ بیوی فوت ہو جائے تو بے اولاد خاوند کو متوفیہ کی جائیداد کا ایک چوتھائی اور با اولاد باپ کو اس کا آدھا ملے گا۔ جائیداد کی تقسیم میں اسلام نے والدین کا حصہ بھی رکھا ہے۔

اسلامی قانون کے رُو سے سابق خاوند اپنی مطلقہ بیوی کے نان نفقہ (لوازمات) کا قطعی ذمہ دار نہیں ہے۔ اسی طرح ایک مسلم معاشرے میں ناجائز بچوں کو جائز قرار دینے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ___ ہندوؤں کا سیکولر ذہن اپنے معاشرے میں حلال و حرام کی یہ تمیز مٹانا چاہتا ہے، تو وہ اُن کا اپنا معاملہ ہے۔ مسلمان اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ اسلام نے چچا اور ماموں کی اولاد سے شادی کی اجازت دی ہے۔ مسلمان پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرسکتا ہے۔ اسلامی قانون کی رُو سے خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اُسے کسی عدالت کا چکر کاٹنا ضروری نہیں ہے۔ یہ قوانین اگر ہندوؤں کے بنائے ہوئے نام نہاد ضابطوں سے متصادم ہوتے ہیں تو مسلمان اپنی اقدار کے تحفظ کے لیے ہر طرح کی صعوبت جھیلنے کو تیار ہیں۔ کیا شنکر اچاریہ سری نگری اور مسٹر جسٹس ڈائی وی چندرا شاد مسلمانوں کے احساسات و جذبات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے!!

یکساں سول کوڈ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بہت بڑی سازش ہے۔ اگر سیکولرازم کا مطلب مذہبی رواداری ہے تو پھر اُسے اسلام دشمنی کا جامہ نہیں پہننا چاہیے۔ مسلمانوں کے خلاف ایسے حربے کریملن کو زیب دیتے ہیں۔ بھارتی پارلیمنٹ کو نہیں۔ ماسکو اور نئی دلی کی پالیسی میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔[۱]

(صاحبِ مضمون: اوصاف سعید واصفی، بحوالہ ریڈی اینس ۱۰ر جنوری ۱۹۸۶ء۔ اُردو ترجمہ نگار فیض اللہ شعائی، ادارہ معارف اسلامی، منصورہ - لاہور)

---

۱ آزاد مسلم ریاستوں، خصوصاً پاکستان والوں کو کچھ شرم کا احتیاط کرنی چاہیے کہ انہوں نے قانونِ شریعت کے ایک ذرے کو بھی اپنی جگہ سے ترقی یا اجتہاد یا ضرورت کے نام پر ہلایا تو یہ چیز اسلام دشمن ریاستوں کو مسلمانوں کے پرسنل لا کے بخیے ادھیڑنے کا اسلامی جواز فراہم کرے گی۔ خدارا دشمنانِ اسلام کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دلیلیں اور نظیریں فراہم نہ کیجیے۔ سعدی کا ایک مشہور شعر یہاں ایک اور انداز سے منطبق ہوتا ہے کہ سے بہ نیم بیضہ چو سلطان ستم روا دارد زنند لشکریانش ہزار مرغ بہ سیخ۔ سو مسلمانانِ کرام! آپ کی وجہ سے ہزاروں مسلمان نہ سیخوں پر بھون ڈالے جائیں گے (مدیر)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

اولاد، خاندان اور معاشرے کی اصلاح

(ادارہ)

(مئی ۱۹۶۸ء کو لاہور میں حلقۂ خواتین کے دو روزہ تربیتی اجتماع کے آخری اجلاس سے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے خطاب فرمایا اور خواتین کے تحریری سوالات کے جوابات دیئے۔ ان میں سے چند سوالات اور ان کے جواب پیشِ خدمت ہیں)۔

سوال:۔ جو بچے اب والدین بن چکے ہیں اور کئی جھگڑوں جھمیلوں میں بھی پھنسے ہوئے ہیں، خدا اور آخرت کی بات بالکل سننا ہی نہیں چاہتے، انہیں تبلیغ کیسے کی جائے کہ اُن کے اندر فکرِ آخرت پیدا ہو، اور وہ سب معاملات رضائے خداوندی کے مطابق انجام دینے لگیں؟

جواب:۔ یہ اور اس کے بعد کے کچھ اور سوالات آپس میں ایک خاص تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہمارا کام کسی شخص کے اندر فکرِ آخرت پیدا کر دینا نہیں ہے، بلکہ ہمارا کام فکرِ آخرت پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ کسی کے اندر فکرِ آخرت پیدا ہو جائے یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ اُس شخص کی اپنی ذمہ داری ہے ـــــ اور اللہ کا فضل شامل ہو اور اس کی دی ہوئی ہدایت کے لیے کان اور دل کُھلے ہوں تو انسان ہدایت پا لیتا ہے۔ ہمارا کام جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی حد تک جو زیادہ سے زیادہ کوشش کر سکتے ہیں، وہ معقول طریقے سے کریں، جس سے ہماری ذمہ داری ادا ہو جائے۔ جب کوئی بچہ بالغ ہو جائے اور خود اس کے اندر سمجھ بوجھ پیدا ہو جائے تو اس کے بعد آپ کا کام صرف اتنا ہے کہ:

آپ ایک تو اپنا صحیح نمونہ اس کے سامنے پیش کریں اور دوسرے حقِ نصیحت ایسے طریقے سے ادا کریں

جس سے اس کے اندر ضد پیدا نہ ہو اور اس کا ذہن اور خیالات اصلاح کی طرف مائل ہو سکیں۔

اپنا نمونہ پیش کرنے سے مراد یہ ہے کہ آپ کے اپنے طرزِ عمل سے اسے یہ محسوس ہو کہ "جن کی ہم اولاد ہیں وہ خدا سے بے نیاز اور بے فکر نہیں ہیں اور ان کے اندر خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس پایا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو کچھ ان کا جی چاہے کرتے ہوں بلکہ وہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرنے والے ہیں"۔ اگر کوئی اولاد اپنے والدین میں یہ شان پائے تو آپ یقین رکھیے کہ وہ خواہ کتنی بگڑی ہوئی کیوں نہ ہو، اس کے دل میں اپنے والدین کی عزت ہوتی ہے۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم بگڑے ہوئے لوگوں کی اولاد نہیں، بلکہ نیک لوگوں کی اولاد ہیں۔

جس اولاد کے دل میں اپنے والدین کے لیے کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہوتی ہے کہ والدین نصیحت تو کچھ اور کرتے ہیں مگر ان کا عمل کچھ اور ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے والدین میں واقعی ایک سچے مسلمان کی سی زندگی پائیں تو میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بگڑے سے بگڑا آدمی بھی ان کے لیے اپنے دل میں احترام محسوس نہ کرے ــــ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ مذہبی کہلاتے ہیں، پیر ہیں یا عالم ہیں ان کی اولاد دہریہ (ATHEIST) اور کھلم کھلا دین کی مخالف اور دین کا مضحکہ اڑانے والی بن رہی ہے، بلکہ بعض اوقات دہریت اور کفر و الحاد کی تبلیغ کرنے والی بن رہی ہے۔ جب کبھی بعض خاندانوں میں، میں نے یہ نقشہ دیکھا تو مجھے معلوم یہی ہوا کہ بظاہر وہ بڑے دیندار خاندان ہیں۔ لیکن دراصل وہاں دین کا محض نام ہوتا ہے۔ اسی لیے ان کی اولاد کے دل میں دین اور اہلِ دین کا وقار ختم ہو جاتا ہے ــ دینداری کی نمائش اور چیز ہے اور دین پہ عمل کرنا دوسری چیز ہے۔ جہاں سچی دینداری ہوتی ہے وہاں اگر اولاد بگڑتی بھی ہے تو کسی بُری صحبت سے بگڑتی ہے لیکن اپنے والدین کی کسی بُری مثال کو دیکھ کر نہیں بگڑتی۔ بلکہ اگر وہ یہ دیکھتے ہوں کہ ان کے والدین واقعی خدا سے ڈرنے والے ہیں تو ان کے دل اپنے طرزِ عمل کو مسلسل محسوس کرتے رہتے ہیں اور یہ احساس کسی نہ کسی وقت جاگ کر اپنا رنگ دکھاتا ہے ــــ چنانچہ جن لوگوں میں واقعی دیانت داری پائی جاتی ہے ان کی اولاد کے متعلق دیکھا گیا کہ وہ اگر بگڑے ہوئے بھی ہیں تو آگے چل کر سنبھل جاتے ہیں، کیونکہ ان کے اوپر خود اپنے والدین کا گہرا اثر ہوتا ہے۔

اِن مثالوں سے میری مُراد یہ ہے کہ اگر ہم اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کے سامنے اپنی بُری مثال پیش نہ کریں۔ بلکہ ہمیشہ اچھی مثال پیش کریں۔

دوسری چیز ہے حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنا

بعض لوگ بے جا اور بھونڈے طریقے سے تبلیغ کرتے ہیں جس سے آدمی کے اندر اُلٹی ضد پیدا ہونے لگتی ہے۔ حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنا یہ ہے کہ اگر آپ دیکھیں کہ آپ کی اولاد پر تعلیم کے یا بری صحبتوں یا ماحول کے بُرے اثرات پڑ رہے ہیں تو انہیں یکا یک، جبر کے ساتھ اس سے ہٹانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ کوشش یہ کریں کہ ان کے خیالات کی اصلاح ہو۔ ان کے اندر رفتہ رفتہ، مناسب موقع دیکھ کر صحیح خیالات اُتارے جائیں۔ اس کے ساتھ انہیں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنے کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اگر والدین معقول طریقے سے اولاد کو توجہ دلائیں تو وہ کچھ نہ کچھ پڑھنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ خود ہمارے اپنے لٹریچر میں اس سلسلے کی کچھ کتابیں مثلاً خطبات اور دینیات وغیرہ اگر بچوں کو پڑھوائی جائیں تو اُن میں سے بیشتر کی کم از کم خیالات کی اصلاح ہو جائے گی۔ اگر وہ ماحول کے اثرات سے غلط راستے پر جا رہے ہوں گے تو ان کے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے گا کہ یہ ماحول غلط ہے اور ہمیں کبھی نہ کبھی اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ کم از کم اتنا ہو گا کہ ان کے دل میں دینی افکار و خیالات اور طریقوں کی عزت پیدا ہو جائے گی۔ وہ یہ محسوس کریں گے کہ حق وہی ہے جو اسلام کی تعلیمات پیش کر رہی ہیں اور اگر ہم غلط راستوں پر جا رہے ہیں تو یہ ہماری غلطی ہے۔ لیکن اس حق میں کوئی باطل نہیں ہے جو ان تعلیمات اور ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر ان دو طریقوں پر عمل کیا جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہیں۔ اس کے باوجود کوئی درست نہ ہو تو یہ آپ کی ذمہ داری نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ فرمایا ہے کہ:

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ

تمہارا کام پہنچا دینا ہے

اس کے باوجود اگر کوئی درست نہیں ہوتا تو یہ اس کی اپنی ذمہ داری ہے، تمہاری نہیں ہے۔

سوال: بچوں میں خدا کی پہچان پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ خصوصاً ان بچوں میں جو کالج میں تعلیم پا رہے ہوں اور دین پسند ماں کی بات، خواہ وہ کیسے ہی اچھے طریقے سے کہے ان

(باقی بر صفحہ ۴۷)

بحث و نظر

ڈرامائی انداز کی طلاق

جناب ملک غلام علی صاحب

عرصہ سے خواہش تھی کہ جسٹس ملک غلام علی صاحب کے قلمِ حق رقم سے کچھ رشحات ترجمان القرآن کے حصّے میں بھی آئیں۔ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ اسی مرتبہ اس خواہش کے اظہار کی تجدید کی اور اسی مرتبہ ملک صاحب کا ذہن کچھ لکھ دینے پر آمادہ تھا۔ سو یہ سطور برکت آگیں قارئین کے لیے حاضر ہیں۔ (ن ۔ ص)

اِن دنوں اخبارات میں اس موضوع پر بحث چھڑ گئی ہے کہ ڈرامائی مکالمے میں خاوند اگر بیوی کو طلاق دے دے جب کہ اس کی نیت طلاق دینے کی نہ ہو، تو ایسی طلاق شرعاً واقع ہو جاتی ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں بیان کردہ واقعات و مکالمات اور موافق و مخالف فتاویٰ سے قطعِ نظر ہمارے لیے بحیثیت ایک مسلمان جو بات سب سے زیادہ رنجدہ اور ناقابلِ برداشت ہے، وہ یہ کہ طلاق کے واقع نہ ہونے کے حق میں بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ علما جس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں کہ ہنسی مذاق میں بھی اگر طلاق بیوی کو دی جائے تو ایسی طلاق واقع ہو جائے گی — یہ روایت حدیث کے مستند مجموعوں میں نہیں ملتی۔ صرف احادیث کے دو غیر مستند مجموعوں طبرانی اور مسند عبدالرزاق میں اس کا ذکر ہے، لیکن ائمہ حدیث نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اسی طرح کا ایک مضمون روزنامہ امروز لاہور ۳۰ دسمبر ۱۹۸۶ء میں پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کے نام سے چھپا ہے۔ جس میں نیل الاوطار للشوکانی کے حوالے سے یہ بات کہی گئی ہے۔ لیکن شہاب صاحب کا یہ دعویٰ ہر لحاظ سے غلط اور باطل ہے۔

نیل الاوطار، کتاب الطلاق میں یہ بات درج نہیں ہے کہ ایسی کوئی حدیث مستند مجموعہائے احادیث میں نہیں ملتی یا ائمۂ حدیث نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ برعکس اس کے نیل الاوطار کتاب الطلاق باب فی الکلام الهازل کی اوّلین حدیث یہ ہے:

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم، ثلاث جِدّهن جدّ وهزلهن جدّ: النکاح والطلاق والرجعة (رواه الخمسة الا النسائی)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں سنجیدہ کلام بھی سنجیدہ شمار ہوگا۔ اور ہنسی مذاق میں کلام بھی سنجیدہ شمار ہوگا: نکاح، طلاق اور طلاق سے رجوع: حدیث کے پانچ مجموعوں میں اسے روایت کیا گیا ہے سوائے نسائی کے)۔

مسالکِ فقہیہ اربعہ کے محدثین و فقہاء کا اس حدیث کی صحت پر اتفاق ہے۔ اس مضمون یا اس سے ملتے جلتے مفہوم پر مشتمل کسی اور روایت کے کسی راوی پر اگر جرح ہو تو اس کا کوئی اثر ہرگز مذکورہ بالا حدیث پر نہیں جو سب کے نزدیک بالاتفاق مستند اور معمول بہ ہے۔ میں طولِ بحث سے بچتے ہوئے یہاں صرف چند حوالے نقل کیے دیتا ہوں۔

المغنی لابن قدامہ فقہ حنبلی کی نہایت مشہور، قابلِ اعتماد اور مفصل کتاب ہے، مکتبۃ الریاض الحدیثہ کی ساتویں جلد میں کتاب الخلع میں عنوان ہے: واذا اتی بصریح الطلاق لزمه نواه او لم ینوه (اگر وہ صراحت کے ساتھ طلاق کا لفظ استعمال کرے تو طلاق لازم آئے گی خواہ اس نے نیت کی یا نہ کی)۔ پھر فرماتے ہیں:

قد ذکرنا ان صریح الطلاق لا یحتاج الی نیة بل یقع من غیر قصد ولا خلاف فی ذالک، ولان ما یعتبر له القول یکتفی فیه به من غیر نیة اذا کان صریحًا فیه کالبیع وسواء قصد المزح او الجد لقول النبی صلی الله علیه وسلم: ثلاث جِدّهن جِدّ وهزلهن جِدّ: النکاح والطلاق والرجعة رواه ابوداؤد، والترمذی وقال ابن المنذر اجمع من احفظ عنه من اهل العلم علی ان الجدّ الطلاق وهزله

سواء روی هذا عن عمر بن الخطاب وابن مسعود۔

(ہم بیان کر چکے ہیں کہ صریح لفظ کے ساتھ طلاق نیت کی محتاج نہیں، بلکہ قصد و ارادہ کے بغیر بھی واقع ہو جاتی ہے، اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ طلاق دینے والے کا قول ہی معتبر ہے اور نیت کے بغیر بھی اس معاملے میں کافی ہے جب کہ لفظ صریح ہو، خواہ اس نے ہنسی مذاق کا قصد کیا ہو یا اپنی بات میں سنجیدہ ہو، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: تین باتیں ایسی ہیں جن میں سنجیدہ کلام بھی سنجیدہ ہے اور مذاقیہ کلام بھی سنجیدہ شمار ہوگا: نکاح، طلاق اور رطلاق سے رجوع۔ امام ابوداؤد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن المنذر نے فرمایا ہے کہ سب علمائے محدثین جن سے ہم نے اخذ کیا ہے ان کا اس پر اجماع ہے کہ طلاق میں سنجیدہ اور مذاقیہ کلام یکساں ہیں، حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے ایسا ہی مروی ہے)

سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق میں یہ حدیث باب فی الطلاق علی الهزل کے تحت مروی ہے۔ عون المعبود شرح سنن ابی داؤد جلد ثانی میں اس حدیث کی تشریح میں فاضل مصنف فرماتے ہیں:

الهزل ان یراد بالشیء غیر ما وضع له بغیر مناسبة بینهما۔

(ہزل کا مطلب یہ ہے کہ ایک کلام سے وہ معنی مراد لیے جائیں جس کے لیے وہ وضع نہیں کیا گیا بغیر اس کے کہ دونوں میں کوئی مناسبت ہو)

سنن ابی داؤد کی دوسری شرح معالم السنن جو امام خطابی کی بلند پایہ تصنیف ہے، انہوں نے اس حدیث کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ضروری حصہ میں عون المعبود ہی سے نقل کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

اتفق عامة اهل العلم علی ان صریح لفظ الطلاق اذا جری علی لسان الانسان البالغ العاقل فانه مواخذ به ولا ینفعه ان یقول کنت لاعباً او هازلاً ولم انو طلاقاً وما اشبه ذلك من الامور واحتج بعض العلماء فی ذلك بقول الله سبحانه وتعالیٰ ولا تتخذوا آیات الله هزواً وقال لو اطلق للناس ذلك لتعطلت الاحکام ولم یؤمن مطلق او ناکح ومعتق ان یقول کنت فی قولی هازلاً فیکون فی ذلك ابطال حکم الله تعالیٰ وذلك

غیر جائز فکل من تکلم بشیٔ، مما جاء ذکرہ فی ھٰذا الحدیث لزمہ حکمہ۔

(اہلِ علم عمومی طور پر متفق ہیں کہ یہ ایک عاقل و بالغ انسان کی زبان سے اگر طلاق کا صریح لفظ ادا ہو جائے تو وہ اس کی گرفت میں ہوگا۔ اور اُسے اس عذر کا کوئی فائدہ نہیں مل سکتا کہ وہ کہے کہ میں نے تو یہ لفظ کھیل یا ہنسی مذاق کے طور پر کہا تھا اور ان سے میری نیت طلاق کی نہ تھی اور اسی سے ملتے جلتے دوسرے عذرات بھی بے فائدہ ہیں۔ بعض علماء نے اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰہِ ھُزُوًا (اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ)۔ اگر لوگوں کو اس میں کھلا چھوڑ دیا جائے تو احکام معطل ہو کر رہ جائیں گے۔ اور کسی طلاق دینے والے، نکاح کرنے والے یا غلام کو آزاد کرنے والے کے بارے میں یہ اطمینان باقی نہ رہے گا کہ وہ ان افعال کو انجام دینے کے بعد یہ کہہ دے کہ میں تو اپنی بات از راہ مذاق کہہ رہا تھا۔ اس طرح احکام الٰہی کا ابطال ہونے لگے گا اور یہ صورت ہرگز جائز نہیں۔ پس اس حدیث میں جن امور کا ذکر ہے، ان کے انجام دینے کا جو شخص بھی کلام کرے گا، اس کے واقع و صادر ہونے کا حکم اس پر لازم آئے گا)۔

یہ حدیث سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق میں بھی اسی طرح مروی ہے۔ مؤطا امام مالک کی جو شرح شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے المسوّٰی کے نام سے لکھی ہے، اس میں باب طلاق الہازل میں امام مالکؒ نے حضرت سعیدؒ بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ ثلاث لیس فیھن لعب، النکاح، والطلاق والعتق، تین امور ایسے ہیں جن میں کھیل کا عذر نہیں ہو سکتا: نکاح، طلاق اور غلام کو آزاد کرنا۔ پھر شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

قلت اتفق اھل العلم علیٰ ان الطلاق الھازل یقع و اذا جری صریح لفظ الطلاق علی لسان العاقل لاینفعہ ان یقول کنت فی قولی لاعباً لانہ لوقبل ذلک منہ لتعطلت الاحکام۔

(میں کہتا ہوں کہ اہلِ علم کا اس پر اتفاق ہے کہ از راہِ مذاق بات کرنے والے کی

طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے، جب کہ ایک صاحب عقل کی زبان سے طلاق کا لفظ صریح طور پہ ادا ہو جائے۔ پھر اس کے حق میں یہ عذر سود مند نہیں ہو سکتا کہ میں تو کھیل کے طور پہ یہ لفظ کہہ رہا تھا۔ اگر یہ بات قابل قبول ہو تو احکام معطل ہو جائیں گے)۔

موطا امام مالک کی شرح جو مالکی فقیہہ علامہ زرقانی نے لکھی ہے، اس میں کتاب النکاح کے اس مقام کی تشریح کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں: یقع طلاق اللاعب اجماعاً (لہو و لعب میں طلاق دینے والے کی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے، اس پر اجماع ہے)۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: لان الھازل قاصد للقول یرید له مع علمه بمعناه و موجبه (وجہ یہ ہے کہ ہنسی مذاق میں بات کرنے والا بھی اپنے قول کا ارادہ رکھتا ہے، اس کے معنیٰ اور نتائج و عواقب کو جانتا ہوتا ہے)۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس کی بنیاد وہ حدیث مرفوع ہے جو ابوداؤد، ابن ماجہ اور ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ (شرح موطا امام مالک جلد رابع ص ۶۴)

اس مسئلے پر مزید بحث کی جا سکتی ہے اور تائیدی حوالے بھی فقہاء و محدثین کے اقوال سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم ایک حق پرست اور انصاف پسند مسلمان کے لیے اتنی بحث کا مطالعہ بھی اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ پروفیسر شہاب صاحب کا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح اور مبنی بر حقیقت ہے کہ ایسی کوئی روایت حدیث کے کسی مستند مجموعے میں موجود نہیں جو اس مضمون پر دلالت کرتی ہو کہ خاوند ہنسی مذاق میں بھی بیوی کو طلاق دے دے تو طلاق واقع ہو جائے گی ___ جو مرد یا عورت اللہ اور اس کے رسول کے کسی حکم یا ہدایت سے اعراض یا انکار کی روش اختیار کرنے پر آمادہ ہو، انھیں چاہیے کہ وہ کھلم کھلا اس کا اقرار و اعلان کریں، جعل سازی، افترا پردازی تو نہ کریں۔

قرآن حکیم اور محروم طبقات

جناب میر محمد حسین صاحب ۔ ایم ۔ اے ۔ فاضل دیوبند

(۲)

غلام آج تو شاید یہ لفظ متمدّن معاشرے کے لیے غیر مانوس بلکہ ناقابلِ برداشت ہو، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ کا ایک دور ایسا بھی گذرا ہے (اور اسے گذرے کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا) کہ یہ طبقہ نہ صرف موجود تھا بلکہ محروم و مظلوم ترین طبقہ تھا۔ بہت سے نام نہاد فلسفیوں اور مذاہب نے اسے ایک ناگزیر ضرورت قرار دیا تھا۔ ہر ملک، ہر مذہب اور ہر معاشرے میں غلام نہ صرف موجود تھے بلکہ اُن کا مال مویشی کی طرح وسیع پیمانے پہ کاروبار ہوتا تھا۔ یہودیوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں مختلف وجوہات کی بنا پر کسی بھی شخص کو غلام بنایا جا سکتا تھا۔ الغرض انسانی معاشرے کے اس طبقے کی دنیا پہ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے لیکن آفتابِ جہان تابِ اسلام کے طلوع ہوتے ہی یہ تاریکیاں چھٹنے لگیں۔ قرآن حکیم نے چھوٹتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ ..... إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۔ کہ تمام انسان چاہے اُن کی رنگتیں، بولیاں اور قومیتیں کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ایک ہی مرد اور عورت کی اولاد ہیں، لہٰذا انسانیت کے ناطے سب برابر ہیں۔ غلام ہونے سے کوئی آدمی چھوٹا اور آزاد ہونے سے کوئی آدمی بڑا نہیں ہو جاتا۔ بڑا وہ ہے جس کا کردار بڑا ہے۔ قرآن کا یہ پہلا کڑکا تھا جس نے ذہنوں میں گڑے ہوئے مولائی و آقائی کے پہاڑوں کو خاشعاً متصدعاً کر دیا۔ اور پھر اسی کی صدائے بازگشت تھی حاملِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ اعلان جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سارے جاہلی امتیازات کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ كُلُّكُمْ بَنُو آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ ۔ قرآن اور حاملِ قرآن کی دی ہوئی اکرام انسانیت کی یہی تعلیم تھی کہ حضرت عمرؓ اپنے ایک عظیم قریشی گورنر کو ڈانٹتے ہوئے پوچھتے ہیں۔

حتی استعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارا۔

قرآنِ حکیم نے صرف اس اعلان اور تعلیم پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ معاشرے میں پہلے سے موجود اس لعنت کو دُور کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ سارے قرآن میں کسی کو غلام بنانے کا کہیں حکم نہیں دیا گیا۔ اور نہ ہی اس کی کوئی صورت بتائی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہر انسان کو فطرۃً آزاد تسلیم کرتا ہے۔ اور ان کی غلامی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ کفار سے جنگ کے نتیجے میں قیدیوں کو غلام بنانے کی ایک صورت اگرچہ اسلام میں ناگزیر حالات کی وجہ سے معمول بہا رہی ہے، مگر قرآنِ حکیم نے اس کی صراحت نہ کرکے، بلکہ اس کے بارے میں سکوت اختیار کرکے اپنا منشا ظاہر کر دیا ہے کہ بہر حال یہ صورت اسے مرغوب و محبوب نہیں۔ ان اقدامات میں سے ایک اقدام یہ بھی تھا کہ غلام کو آزاد کرنا ایک بہت بڑی نیکی قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا کہ:

فلا اقتحم العقبۃ وما ادرٰئک ما العقبۃ فک رقبۃ (البلد)

اس ترغیب کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے بے شمار غلام، لوگوں سے خرید خرید کر آزاد کرنے شروع کر دیے۔ دوسرا کام یہ کیا کہ جنگ میں قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً (بلا معاوضہ) چھوڑنے کا حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جنگوں میں حضورؐ نے قیدیوں کو غلام بنائے رکھنے کی بجائے آزاد کر دیا۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

حتّٰی اذا اثخنتموھم فشدّوا الوثاق فاما منّا بعد واما فداء (محمد)

اگر کوئی شخص اپنے غلام کو فی سبیل اللہ آزاد نہیں کر سکتا اور غلام کے پاس اپنی قیمت ادا کرنے کے لیے رقم موجود ہے یا وہ اس کا انتظام کر سکتا ہے تو مالک کو اُسے قیمت لے کر آزاد کرنے کا حکم دیا۔ اسے اسلام کی اصطلاح میں مکاتبت کہتے ہیں۔ قرآن حکیم کا حکم ہے:

والذین یبتغون الکتٰب مما ملکت ایمانکم فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیرا و اٰتوھم من مال اللہ الذی اٰتاکم۔ (النور)

قسم، ظہار، قتلِ عمد اور قتلِ خطاء وغیرہ جرائم کا ایک کفارہ یہ بھی مقرر کیا کہ غلام آزاد کیے جائیں۔ دوسرے مذاہب کے برخلاف آزاد انسانوں کے مقابلہ میں غلاموں کے لیے جرائم کی سزائیں نصف کی حد تک کم رکھیں اور ان کے فرائض میں بھی تخفیف کر دی۔ یہ رویہ اسلام کے اس جذبۂ ترحم و شفقت

کا پتہ دیتا ہے جو وہ غلاموں کے متعلق اپنے اندر رکھتا ہے۔ مصارفِ زکوٰۃ کی ایک مد غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے مخصوص کر دی اور اس طرح غلاموں کی آزادی کو حکومت یا پورے معاشرے کی ذمہ داری بنا دیا۔

مشرک مرد اور عورت چاہے وہ ظاہری اور مادی لحاظ سے کتنے ہی پرکشش کیوں نہ ہوں، ان کے مقابلے میں مومن غلام یا کنیز کو بہتر اور افضل قرار دے کر، ان سے مسلمانوں کو نکاح کرنے کی ترغیب دی اور اس طرح اس معاشرتی دیوار میں شگاف ڈال دیا جو آزاد اور غلام کے درمیان حائل تھی۔ اس سلسلے کی درخشاں مثال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس طرح پیش کی کہ قریش کے اونچے گھرانے کی ایک عورت ــــ حضرت زینبؓ ــــ کا نکاح اپنے ایک سابق غلام حضرت زیدؓ سے کر دیا اور اس سلسلے میں اٹھنے والے طوفانِ طعن وتشنیع کی قطعاً پروا نہ کی۔ اس کے بعد یہ باب ایسا وا ہوا کہ غلاموں کے حوصلے بلند ہوئے اور انہوں نے بلا حجاب قریش کے اعلیٰ خاندانوں میں نکاح کے پیغام دیئے اور وہ قبول ہوئے۔

قرآنِ حکیم کی پیدا کردہ احترامِ انسانیت کی یہی وہ رُوح تھی جس کے پیشِ نظر حضورؐ نے غلاموں کے لیے عبد اور ان کے مالکوں کے لیے مولیٰ اور رب کے الفاظ کا استعمال ممنوع قرار دیا۔ اور ان سے حُسنِ سلوک کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

هم اخوانكم جعلهم الله تحت ايديكم فمن كان اخوه تحت ايديه فليطعمه مما ياكل وليلبسه مما يلبس ولا يكلفه ما يغلبه فان كان مما يغلبه فليعنه۔

مَیں اس فرمانِ نبوی کا ترجمہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہتا تاکہ عربی نہ جاننے والے بھی اس کا مفہوم سمجھ لیں اور دیکھیں کہ اسلام کی تعلیم کتنی بلند ہے اور کس بے دردی سے ہم نے اس کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ حضورؐ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ غلام (کوئی گھٹیا مخلوق نہیں بلکہ) تمہارے ہی بھائی بند ہیں، جنہیں اللہ نے تمہارا زیردست بنا دیا ہے۔ پس تم میں سے جس کے ماتحت کوئی ایسا انسان ہو، اُسے چاہیے کہ اُسے اُسی کھانے میں سے کھلائے جو وہ خود کھا رہا ہو۔ اور اسی قسم کا لباس پہنائے جو وہ خود پہن رہا ہے۔ اور اس پر کام کا اتنا بار نہ ڈالے جس کے تلے وہ دب کر رہ جائے۔ اگر سُوئے اتفاق سے

ایسا کوئی کام دے دیا ہے تو پھر خود بھی اس کا ہاتھ بٹائے۔ پیغمبر اسلام کی اس تعلیم پہ تو سر دھنیے، مگر ان کے نام لیواؤں کے طرزِ عمل پہ اپنا سر پیٹ لیجیے۔

قرآنِ حکیم اور حاملِ قرآن کی اس تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ ہمارے اسلاف نے غلاموں کو بیٹوں کی طرح پالا اور اپنی بیٹیاں ان کے نکاح میں دے دیں۔ یہ امتیاز غالباً صرف مسلمان قوم کو حاصل ہے۔ کہ اس کی تاریخ میں برصغیر پہ خاندانِ غلاماں اور مصر پہ خاندان ممالیک (وجہ غلاماں ہی کا مترادف ہے) مدتوں حکمران رہے۔ اور مسلمانوں نے ان کی بالکل اسی طرح جان و دل سے اطاعت کی جس طرح وہ کسی بڑے سے بڑے خاندانی حکمران کی کرتے تھے۔

اسلام نے معاشرے میں غلام کا مرتبہ اتنا اونچا کر دیا تھا اور غلاموں نے اس حوصلہ افزا فضا میں اپنی صلاحیتوں کو اس طرح چمکایا کہ بنی اُمیہ کا مغرور خلیفہ عبدالملک بن مروان اس وقت سر بہ گریبان رہ گیا جب اُسے بتایا گیا کہ اس وقت مکہ، یمن، مصر، شام، جزیرہ اور بصرہ وغیرہ مرکزی شہروں کی علمی سیادت عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان، یزید بن صہیب، مکحول بن مہران، ضحاک بن مزاحم اور حسن بن ابوالحسن جیسے غلاموں یا غلام زادوں کو حاصل ہے۔ جنگ موتہ کی مہم میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام زادے اسامہ بن زید کو سپہ سالار بنا کر اور بڑے بڑے قریشی زعماء کو ان کے زیرِ کمان دے کر غلاموں کے احساس کہتری کو مٹانے اور سادات و کبراء کے احساس برتری کو کچلنے اور انسانی حریت و مساوات کی ایک نہ بھولنے والی مثال قائم کر دی۔

آج اگرچہ غلامی کے آثار مٹ چکے ہیں تاہم نام کی تبدیلی کے ساتھ یہ لعنت اب بھی موجود ہے۔ قرآنِ حکیم نے عظمت و احترامِ انسانیت کی جو تعلیم دی تھی۔ اگر اُسے قائم رکھنا ہے تو ہمیں غلاموں کے اس طبقے کے ساتھ جو اس دور میں ملازمین، خدام اور محنت کش کے نام سے مشہور ہے، ہمیں اپنا رویہ بدلنا ہوگا۔ حضورؐ کے اس فرمان کو ایک دفعہ پھر اپنے ذہنوں میں تازہ کیجیے کہ: "وہ تمہارے بھائی ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ پس تم میں سے جس شخص کے ماتحت اگر کوئی ایسا شخص ہو تو اُسے چاہیے کہ اُسے وہی کھانا کھلائے جو خود کھاتا ہے، وہی لباس پہنائے جو وہ خود پہنتا ہے، اسے ایسا کام نہ دے جو اس کی استطاعت سے زیادہ ہو اور اگر ایسا کر بیٹھے تو وہ خود بھی اُس کی مدد کرے"۔

یہ ملازم و خدام اور یہ محنت کش بھی تو ہمارے بھائی ہی ہیں جنہیں گردشِ زمانہ نے ہمارے ماتحت

کر دیا - کاش! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا فرمان سے روشنی حاصل کریں - اسے اپنا اُسوہ بنائیں - اگر ہمارے دلوں میں قرآنِ حکیم کی تعلیم کا کچھ بھی پاس ہے اور ہمارے نزدیک اُسوۂ رسولؐ کی کچھ بھی اہمیت ہے تو ہمیں چاہیے کہ ان لوگوں کے مشاہرے، معاوضے، اُجرتیں اور شرائطِ کار و ملازمت طے کرتے وقت اس فرمانِ نبوی کو مشعلِ راہ بنائیں - اُن کے یہ مشاہرے اتنے ہوں کہ وہ ہم سا لباس پہن سکیں اور ہم سا کھانا کھا سکیں - انہیں گدھے اور بیل سمجھ کر ان کی پیٹھ پر بوجھ کا آخری تنکا بھی نہ ڈال دیں، بلکہ انہیں انسان تصور کرتے ہوئے ان کی اوسط استعداد کے مطابق کام دیں - اور اُن کی قوتِ کارکردگی کو قائم اور مسلسل رکھنے کے لیے ان پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں کہ وہ قبل از وقت دم توڑ دیں بلکہ انہیں آسائش و آرام کا موقع بھی دیں اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمارا ان سے سلوک ایسا ہو جیسا ایک شریف انسان کا کسی معزز انسان کے ساتھ ہوتا ہے، بلکہ مسلمان ہونے کے ناطے اُس میں اخوت، بھائی چارے اور اپنائیت کی رُوح کارفرما ہونی چاہیے - مگر یہ جبھی ممکن ہے کہ سرمایہ دار آجر کے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ اس کا سنہری یا روپہلی سکّہ محنت کش کے سُرخ خون سے افضل ہے - اور وہ محنت کو بھی اتنی ہی اہمیت و فوقیت دے جتنی وہ اپنے دھات کے سکے یا کاغذ کے نوٹوں کو دیتا ہے اور وہ کام کرنے والے کو نوکر اور اپنے آپ کو آقا سمجھنا بند کر دے اور فریقین کے اس تعامل کو باہمی تعاون تصور کرے - جب تک سرمایہ دار (آجر) کے ذہن میں یہ انقلاب نہیں آتا، یہ ملازم، یہ خدام، یہ محنت کش بیسویں صدی کے غلام بنے رہیں گے اور غلامی کی ہر قسم کو مٹانے کا قرآنی مقصد شرمندۂ تعبیر رہے گا -

(باقی)

حُرمتِ شراب

جناب ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب - مدینہ منورہ

(۲)

شراب کی بُرائی کے متعلق بعض احادیث

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ - قَالَ سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَدِیْثاً لَا یُحَدِّثُکُمْ بِہٖ غَیْرِیْ قَالَ: مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَۃِ اَنْ یَّظْہَرَ الْجَہْلُ وَیَقِلَّ الْعِلْمُ وَیَظْہَرَ الزِّنَا وَتُشْرَبَ الْخَمْرُ وَتَقِلَّ الرِّجَالُ وَیَکْثُرَ النِّسَاءُ حَتّٰی یَکُوْنَ لِخَمْسِیْنَ امْرَاَۃً قَیِّمُہُنَّ رَجُلٌ وَّاحِدٌ -

(البخاری کتاب الاشربہ)

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے جسے میرے سوا اور کوئی نہیں وہ حدیث بیان نہیں کرے گا - آپ نے فرمایا کہ قیامت کی نشانیوں میں سے جہالت کا ظاہر ہونا، زنا کی کثرت اور شراب نوشی کا دَور دورہ ہونا، مردوں کا تعداد میں کم اور عورتوں کا زیادہ ہونا حتیٰ کہ پچاس عورتوں کے لیے صرف ایک قیم یعنی منتظم ہوگا -

عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ - قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا سَکِرَ فَاجْلِدُوْہُ فَاِنْ عَادَ فَاجْلِدُوْہُ فَاِنْ عَادَ فَاجْلِدُوْہُ ثُمَّ قَالَ فِی الرَّابِعَۃِ فَاِنْ عَادَ فَاضْرِبُوْا عُنُقَہٗ"

(سنن ابن ماجہ حدیث رقم ۲۵۷۲)

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر شرابی شراب پیئے تو اُس کے کوڑے مارو اور اگر دوبارہ پیئے تو کوڑے مارو اگر تیسری دفعہ پیئے تو کوڑے مارو۔ اگر چوتھی دفعہ پیئے تو اُس کی گردن اُتار دو"۔

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ: قَالَ اَوْصَانِیْ خَلِیْلِیْ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَشْرَبِ الْخَمْرَ فَاِنَّهَا مِفْتَاحُ كُلِّ شَرٍّ۔

(سنن ابن ماجہ حدیث رقم ۳۳۷۱)

ترجمہ: "حضرت ابو درداء کہتے ہیں کہ مجھے وصیت فرمائی میرے دوست آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ شراب نہ پینا کیوں یہ ہر بُرائی کی چابی ہے"۔

"حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص شراب پیتا ہے اُس کی نماز چالیس دن اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے"۔

(سنن ابن ماجہ حدیث رقم ۳۳۷۷)

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مُدْمِنُ خَمْرٍ (سنن ابن ماجہ حدیث رقم ۳۳۷۶)

ترجمہ "حضرت ابو درداء روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے نبی نے فرمایا کہ ہمیشہ شراب نوشی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

اس موضوع پر کتب احادیث بھری پڑی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بُرائی سے ہمیں محفوظ رکھے، آمین۔

طبی نوٹ	ALCOHOL BP/PNF	الکحل	الکحل مطلق	ایب سولیوٹ الکحل
ڈائیلوشن الکحل	۹۵٪	۹۰٪	۸۰٪	

الکحل یعنی شراب شہد، سیب، انگور، کھجور، کشمش، منقہ، گندم، گیہوں، گنے اور کیکر کے چھلکے وغیرہ سے بنائی جاتی ہے۔

مزاج = مختلف شرابوں کا مزاج مختلف ہوتا ہے، مگر پرانی شراب کا مزاج گرم وخشک ہوتا ہے۔

اِس خانہ خراب کے کئی نام ہیں، جس مادہ سے شراب بنتی ہے، اسی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔عام نام یہ ہیں:

برانڈی، وائن، سپرٹ، شیمپین، پورٹ، شیری، کلیرٹ، سپرٹ، ریکٹی فائیڈ، وسکی اور ڈائیلوشن وغیرہ۔

بنانے کا طریقہ پھلوں وغیرہ کے رس میں خمیر (الکحل یا سڑاند[ا]) پیدا کرکے پھر اس خمیر کا عرق کھینچا جاتا ہے۔ اِس عمل کشید سے حاصل شدہ پانی کو شراب کہا جاتا ہے اور اسی نشہ آور مادہ کو اسلام نے مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیا ہے۔

کانجی، پھلوں سے حاصل کردہ تازہ رس جو اگرچہ ڈبوں میں محفوظ کرلیے جائیں شرعاً جائز اور حلال ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ -

"اے نبی! تو کہہ دے کہ اس میں گناہ زیادہ ہیں اور فوائد کم"۔

اَمَّا اِثْمُهَا فَهُوَ فِي الدِّيْنِ وَاَمَّا الْمَنَافِعُ فَدُنْيَوِيَّةٌ مِنْ حَيْثُ اَنَّ فِيْهَا نَفْعَ الْبَدَنِ وَ تَهْضِيْمَ الطَّعَامِ وَاِخْرَاجَ الْفُضْلَاتِ وَتَشْحِيْذَ بَعْضِ الْاَذْهَانِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ -

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتے ہیں:

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا - (سورہ النحل ایت ۶۷)

اور پھلوں میں سے کھجور اور انگور کے درختوں سے ہم تمہیں ایک چیز پلاتے ہیں، جسے تم

ا یہ وہ مادہ ہوتا ہے جو سڑکر تعفن کی شکل میں الکحل کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

نشہ آور بھی بنا لیتے ہو۔ اور پاک رزق بھی۔

یہاں نشہ آور سے مراد شراب ہے۔ اور پاک رزق سے مراد کھجور اور انگور کے پاکیزہ پھل اور ان سے حاصل کردہ پاکیزہ مشروبات ہیں۔ نہ کہ عقل و خرد کو زائل کرنے والی شراب۔

شراب میں ایک قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ آدمی کے قریب آتے ہی پہلے تو اس کی بدبو اور سڑاندناک میں پہنچتی ہے۔ پھر اس کا مزا آدمی کے ذائقہ کو تلخ کرتا ہے۔ پھر حلق سے اترتے ہی وہ پیٹ پکڑ لیتی ہے۔ پھر وہ دماغ کو چڑھتی ہے اور دورانِ سر لاحق ہوتا ہے۔ پھر وہ جگر کو متاثر کرتی ہے اور آدمی کی صحت پر اُس کے بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پھر جب اُس کا نشہ اُترتا ہے تو آدمی خمار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ سب جسمانی نقصانات ہیں۔ دُنیا میں انسان اسے پی کر بہکتا ہے اور بکتا ہے اور یہ سب وہ اپنے سرور کی خاطر کرتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت - آیت ۴۶)

چمکتی ہوئی شراب جو پینے والوں کے لیے لذت ہوگی۔

اور یہ اس شراب کا ذکر ہے جو جنتیوں کو پلائی جائے گی جو نشہ سے پاک وصاف ہوگی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کے فوائد کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔

— مخدر ہونے کی وجہ سے بعض امراض میں مسکن کا کام دیتی ہے۔

— ہاضم ہے جسم کو فربہ کرتی ہے۔

— دل کی حرکت کو تیز کرتی ہے، جس سے دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے، جس سے نبض اور تنفس کی حرکات تیز ہو جاتی ہیں۔

— شرابی اپنے آپ کو ہوا میں اُڑتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

— شرابی اپنے آپ کو مسرور محسوس کرتا ہے۔

نقصانات:

— شراب ام الخبائث یعنی گناہوں کی ماں ہے۔

— شرابی اپنے بُرے بھلے کی تمیز نہیں کر پاتا، یعنی ماں، بہن، بیٹی اور بیوی میں تمیز نہیں کر پاتا۔

— شرابی خیالی دنیا میں بسنے لگتا ہے۔

۔ شرابی اپنے بیوی بچوں کی دیکھ بھال کے فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔
۔ شرابی کا چال چلن خراب ہو جاتا ہے۔ جس کی بنا پر معاشرہ میں اس کا وقار باقی نہیں رہتا۔
۔ شرابی کے دانت، اس کا معدہ، جگر، اعصاب اور چہرہ اکثر متاثر ہوتے ہیں۔
۔ شرابی کسی بھی جرم سے دریغ نہیں کرتا مثلاً چوری، ڈاکہ، زنا، قتل وغیرہ۔ اسی وجہ سے یورپین ممالک میں جرائم کی رفتار باقی دنیا سے کہیں زیادہ ہے[1]
۔ شرابی کے منہ سے تعفن اور بدبو آتی ہے، جس سے وہ کسی محفل میں بھی پسندیدہ انسان نہیں سمجھا جاتا۔
۔ دیسی شرابوں میں اعلیٰ قسم کی شرابوں میں سے زیادہ فیوزل آئیل اور دیگر قسم کے مضر اجزا زیادہ ہوتے ہیں۔
۔ کسی بھی قسم کی شراب پینے والا شرابی اپنی آنکھوں کی قدرتی چمک کھو بیٹھتا ہے۔
۔ چونکہ شراب خانہ خراب چہرہ کی خوبصورتی پر نمایاں اثر رکھتی ہے۔ دورانِ خون تیز ہو جانے سے جلد کی ضرورت سے زیادہ اس کو غذائیت ملتی رہتی ہے، جس کی وجہ سے چکنائی کے غدود اور پسینہ کے غدودوں کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے چہرہ کی جلد موٹی کھردری اور بھدی ہو جاتی ہے۔

شراب کا نشہ: شراب نوشی سے تقریباً پندرہ منٹ کے بعد نشہ چڑھتا ہے۔ عادی شرابیوں میں یہ نشہ دیر سے چڑھتا ہے۔
۔ سر چکرانے لگتا ہے، جسم میں سنسنی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔
اگر نشہ یک لخت چڑھ جائے یعنی پینے والا نوآموز ہو تو الٹیاں بھی آنے لگتی ہیں اور وہ نیم بیہوشی کی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں شرابی اپنے آپ کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ یہ نشہ تقریباً آٹھ گھنٹے کے بعد اترتا ہے۔ پرانے شرابیوں میں نشہ زیادہ شراب پینے سے چڑھتا ہے۔ منفوڑی پینے

---

[1] سڑکوں کے حادثات میں شرابیوں کا بڑا حصہ ہے اور ان کی وجہ سے ہر سال قوم کو مالی اور جانی نقصان بھگتنا پڑتا ہے۔

سے کم نشہ ہوتا ہے۔

نشہ اُترنے کے بعد خمار سا پیدا ہوجاتا ہے اور انسان شیر سے بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ اعلیٰ مراکز پر مضعف و منعکس اثر ڈالتی ہے۔ تحریک کے بعد تخدیر ہوتی ہے۔ لہٰذا اعصاب اور دماغ شکست ہو کر غنودگی (خمار) پیدا ہوجاتی ہے۔

الکحل میں ادویات و مرکبات کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس لیے الکحل کو ٹنکچرز اور سپرٹس وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔

اور یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ نے ایک پاکیزہ چیز شہد (HONEY) میں رکھ دی ہے ــــ الکحل کے بجائے شہد کو اگر فنِ دوا سازی میں استعمال کیا جائے تو بہ زیادہ مناسب ہوگا۔ کیوں کہ شہد کا خاصہ ہے کہ یہ نہ خود سڑتا ہے اور نہ دوسری چیزوں کو اپنے اندر سڑنے دیتا ہے، بلکہ محفوظ رکھتا ہے۔ صدیوں پہلے فنِ دوا سازی میں مستعمل رہا ہے۔ اگر مسلمان ڈاکٹرز، کیمسٹس اس پر تجربات کریں تو کامیابی کے علاوہ مسلمانوں کو شراب سے مبرا دوائیں دستیاب ہوسکیں گی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فِيهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ - یعنی شہد میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔

دواؤں میں مل کر شفا بخشی کا عمل بھی تیز ہوسکتا ہے اور پاکیزگی کا دامن بھی تھاما جاسکتا ہے۔ جدید تحقیق سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ شہد میں دو مختلف قسم کی شیرینیاں ہوتی ہیں، جن کو لیولوز اور گلوکوز کہتے ہیں۔ نیز شہد میں حیاتین ا، ب اور ج مختلف مقداروں میں پائی جاتی ہیں۔

اسلام پر جی ایم سیّد کے اعتراضات

جناب پروفیسر سیّد محمد سلیم صاحب

(۲)

ختنہ | یہ دراصل ملّی لحاظ سے سنّتِ ابراہیمی ہے۔ فی نفسہٖ اس کی حکمتیں اور فوائد اتنے واضح ہیں کہ اب غیر مُسلم معاشرے بلکہ بعض ملحد ڈاکٹر تک بھی اس کے قائل ہیں کہ ختنہ کرانے سے کئی قسم کی بیماریوں سے تحفظ مل جاتا ہے۔ بصورتِ دیگر زائد جھلی (جسے ختنہ کے عمل سے الگ کر دیتے ہیں) کے نیچے میل یا جراثیم جمع ہو کر درد و سوزش کے علاوہ بعض ایسی تکالیف کا باعث بنتے ہیں کہ جو آسانی سے علاج پذیر نہیں ہوتیں۔

بہتر ہوگا کہ اس مسئلے پر طب و صحت کا کچھ اہم لٹریچر معترضین پڑھ لیں۔

ختنہ کا طریقہ مسلمانوں کے لیے جن وجوہ سے ایک نعمت ہے۔ ان حکمتوں کی طرف ڈاکٹروں کی نظر بھی نہیں گئی ہے اور نہ ان کو یہاں تفصیل سے بیان کرنا ممکن ہے۔ اسلامی شریعت نے اس کو ۱۴سو سال قبل رائج کر دیا۔ حالانکہ اس وقت تو کیا آج بھی بہت سے لوگوں کو تفصیل سے اس کی حکمتیں معلوم نہیں ہیں۔

خلفائے راشدین | خلفائے راشدین کا طرزِ حکومت اور ذاتی کردار ایک مثالی طرزِ عمل تھا۔ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دوسرے لوگوں کو بھی اس دَور کا معیاری اور مثالی ہونا تسلیم ہے۔ ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں کانگریس نے قومی حکومتیں قائم کیں۔ سات صوبوں کے اندر۔ اس موقع پر گاندھی نے اپنے وزرا کے نام کُھلا خط شائع کیا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

"ہمارا مقصد عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے سے حصولِ اقتدار یا حصولِ دولت

نہیں ہے ، بلکہ رام راجیہ (خدا کی بادشاہت) قائم کرنا ہے - رام راجیہ کے قیام کے لیے ہمیں اشوکا یا وکرما جیت کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے - بلکہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کی طرف دیکھنا چاہیے - اور ان کی پیروی کرنا چاہیے - کیونکہ تاریخِ عالم میں میرے نزدیک ان کے عہدِ خلافت سے بہتر رام راجیہ کا نمونہ نہیں ملتا" (اخبار برہمن - اگست ۱۹۳۷ء)

ستم ظریفی دیکھیے گاندھی ایک ہندو، غیر مسلم - تو خلافتِ راشدہ کو ساری دنیا میں بہترین طرزِ حکومت قرار دیتا ہے اور اولادِ رسول سید غلام مرتضیٰ شاہ اس کو استحصالی دور قرار دیتا ہے -

اسلامی حکومت جی ایم سید کی تیز نگاہوں کو خلافت میں تو سامراج نظر آگیا - مگر ان کے ممدوح روس کا سامراج نظر نہیں آتا حالانکہ روس کی کمیونسٹ حکومت نے :

— سات صدیوں سے آباد ترک اور تاتاری اقوام کو کریمیا کی سرزمین سے اکھاڑ کر سائبیریا کے برفستانوں میں پھینک دیا (۱۹۴۵ء) اور وہ وہاں ٹھٹھر کر مر رہے ہیں - صرف اس لیے کہ یورپ کی سرزمین میں مسلمان آباد نہ تھے - واضح رہے کہ کریمیا بحرِ اسود کے کنارے واقع ہے -

— اس نے پولینڈ میں اور چیکوسلوکیہ میں کیا کیا ؟ کیا یہ سامراج نہیں ہے ؟

— اور اب افغانستان میں کیا کر رہا ہے - کیا یہ سامراج نہیں ہے ؟

— ابھی اگلے ماہ چین سے اس نے ایک معاہدہ کیا ہے - جس کے تحت وہ بیرونِ منگولیہ کا قبضہ چھوڑ دے گا -

گویا اب تک چین کے علاقے پر غاصبانہ قبضہ تھا - ورنہ چھوڑنے کے کیا معنی - کیا یہ سامراج نہیں ہے ؟ خلافتِ راشدہ کا تو وہ دور تھا کہ جب کسی مجبوری سے خالد بن ولید کو شہر حمص کو چھوڑنا پڑا تو انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں سے لیا ہوا جزیہ ان کو واپس کر دیا کہ اب ہم آپ کا تحفظ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں - یہ تھا ان کا عدل - نہاوند کی جنگ میں ایک عام مسلمان نے اہلِ شہر کو امان دے دی - کمانڈر نے اور خلیفہ نے اس کو برقرار رکھا کہ ایک مسلمان کا وعدہ ہم سب کا وعدہ ہے - ان کو امان مل گئی - یہ تھا وعدے کا ایفا -

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم

محمد بن قاسم راجہ داہر نے اول تو ایسی حرکت کا ارتکاب کیا جو تمام مذاہب میں اور تمام معقول

انسانوں کے نزدیک قبیح ترین گناہ ہے۔ اس نے اپنی بہن سے نکاح کیا۔ اس سے وہ بدنام ہوا۔ دوم یہ کہ سندھ کی تمام آبادی بدھ مت کی پیروکار تھی۔ راجہ داہر باہر سے آکر ان پر مسلط ہو گیا۔ اور اپنا ہندو مت ان پر بزور مسلط کر دیا۔ ان وجوہ کی بنا پر یہاں کی آبادی اس سے راضی نہ تھی۔ اسی وجہ سے آبادی نے عربوں کا استقبال کیا تھا۔ سندھیوں کی رائے محمد بن قاسم کے متعلق کیا تھی؟ اس کا اندازہ ان کی بے پناہ محبت سے ہوتا ہے۔ جب ان کو اطلاع ملی کہ اس کو شہید کر دیا گیا ہے تو انہوں نے من کھیڑہ کے مندر میں اس کا بت بنا کر رکھا۔ سو سال بعد کے مؤرخ بلاذری کے الفاظ یہ ہیں: صَوَّرُوْهُ بِالْكِيرَجِ (کھیڑہ میں اس کا بت بنایا) شادی بیاہ کے تعلقات پر اعتراض کا کیا مطلب ہے۔ کیا عرب اور سندھی گھل مل کر ایک قوم نہ بنتے؟ کیا عرب بھی سندھیوں کو اچھوت بنا کر رکھتے؟ جس طرح ہندوؤں نے دراوڑوں کو اچھوت بنا کر رکھا ہے۔

مذہب خوف کی پیداوار جی ایم سید بار بار اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ مذہب انسان کے جذبۂ خوف کی پیداوار ہے۔ دراصل انیسویں صدی کے ماہرین نسلیات (ANTHROPOLOGY) کا اس زمانہ میں یہی خیال تھا، مگر بیسویں صدی کے آغاز ہی میں یہ بات غلط ثابت ہو گئی۔ مشہور پروفیسر شمٹ لکھتا ہے:

"اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی عمران (SOCIETY) کی اعلیٰ ترین ہستی فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا۔"

THE ORIGIN AND GROWTH OF RELIGON — BY PROF W SCHIMIDI — 19

دوسرا جرمن محقق (RALF BARON EHREUFEL) لکھتا ہے:

"ثقافتی تاریخ انسانی کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانی معاشرہ کا پہلا مذہب توحید ہی تھا۔ اور قدیم ترین قبائل جن کا مادی اثاثہ حد درجہ قلیل ہے۔ ان کا اخلاقی معیار بہت بلند ہے۔"

ISLAMIC CULTURE — HYDER ABAD DECCAN 1944 P-446

اس کے صاف معنیٰ یہ ہوئے کہ انسان اوّل موحّد تھا اور با اخلاق تھا۔ بداخلاقی اور وحشت بعد میں داخل ہوئی ہے۔ یہی کچھ قرآن مجید کہتا ہے:

"ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت برقرار نہ رہی)، ان کے اندر اختلافات پیدا ہوئے (بداخلاقی آئی)، تب اللہ تعالیٰ نے (ہدایت کے لیے) نبیوں کو بھیجا۔ (بقرہ - ۲۱۲)

قیامت اور آخرت

انیسویں صدی میں سائنس دان قیامت اور آخرت کے منکر تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ مادہ فنا نہیں ہوتا ہے۔ صرف شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ اس زمانہ میں دُنیا کے فنا ہونے پر یقین نہیں تھا۔ اب بیسویں صدی میں مادہ ٹوٹ گیا، فنا ہوگیا۔ ادھر ریاضی کی ایک شاخ حرارتی حرکیات (THERMO DYNAMICS) کے قانون نمبر ۲ کے تحت اب یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ سورج کی گرمی بتدریج کم ہو رہی ہے۔ ضرور ایک دن آئے گا جب یہ بے نُور ہو جائے گا۔ یہی بات قرآن مجید کہتا ہے کہ اس دن ستارے بے نُور ہو جائیں گے۔ اس لیے اب قیامت کا آنا سائنسدانوں کے نزدیک بھی یقینی ہے۔

اب ذرا اس حقیقت کی طرف غور کریں کہ دُنیا میں دو قسم کے افراد پائے جاتے ہیں۔ ایک چنگیز خاں ہلاکو خاں، ہٹلر اور مسولینی جیسے لوگ جنھوں نے ظلم اور غارت گری کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ دوسری جانب سقراط، بدھ اور حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام جنھوں نے حق و انصاف اور نیکی اور خیر کی اشاعت کی۔ اب اگر سب مر کر مٹی میں مٹی بن جاتے ہیں تو در حقیقت نیک لوگ اور بدکردار لوگ سب برابر ہو گئے۔ نیکی اور بدی سب برابر ہو گئی۔ عقلِ سلیم اس بات کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔ ضرور ایک دن ایسا آنا چاہیے جب نیکوں کو نیکی کا اجر ملے اور بدوں کو بدی کی سزا ملے۔ بس یہی آخرت ہے۔

عقل پرستی

ہر مردِ معقول تسلیم کرے گا کہ انسانی عقل ترقی کرتی رہتی ہے۔ ریاضی کے جس مسئلہ کو ارشمیدس نے بڑی محنت سے دریافت کیا تھا وہ آج کل نویں دسویں کے لڑکے پڑھتے ہیں۔ پھر ایک ہی زمانہ میں تمام انسانوں کی عقلیں یکساں نہیں ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سابق وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی نے آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت پر اردو میں ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ مسئلہ اضافیت کے سمجھنے والے ساری دُنیا میں آٹھ افراد ہیں یعنی اربوں کی آبادی

میں صرف آٹھ افراد سمجھنے والے ہیں۔ حالانکہ یہی وہ مسئلہ ہے جس کی بنا پر انسان چاند پر پہنچا اور ستاروں پر پہنچ رہا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اگر کسی بات کو نہ صرف چند افراد بلکہ لاکھوں کروڑوں افراد بھی نہیں جانتے اور نہیں سمجھ سکتے۔ تب بھی وہ بات صحیح ہوسکتی ہے۔ صرف شرط یہ ہے کہ بتانے والا استاد معتبر اور مستند ہو۔ عالمِ آخرت اور جنت دوزخ کے امور انسانی عقل سے ماوریٰ ہیں۔ انسان کے پاس ان کو سمجھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پانچ صدی قبل ابن خلدون نے اس بات کو خوب سمجھایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی سنار اپنے کانٹے سے پہاڑ تولنے کی کوشش کرے گا تو ناکام ہوگا۔ اسی طرح عقائد متعلق آخرت بھی عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ مغربی فلسفی کانٹ کہتا ہے عقل انسانی مادی الاصل ہے۔ حواس پر اس کی بنیاد ہے۔ وہ عالمِ بسیط کے حقائق کی کنہ دریافت کرتے ہیں قطعاً ناکام ہے۔

یہ مذہبی حقائق ضرور عقل کی دسترس سے ماوریٰ ہیں، مگر خلافِ عقل ہرگز نہیں ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا سائنسدان آئن سٹائن کہتا ہے:

"یہ اقدار (مذہبی احکام) تجربات کے بعد وضع نہیں کیے گئے ہیں، بلکہ یہ برگزیدہ ہستیوں (انبیاء کرام) کی وساطت سے بذریعہ وحی و الہام موصول ہوئے ہیں۔ ان کی بنیاد عقلِ انسانی پر نہیں ہے۔ تاہم یہ تجربہ کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ صداقت کہتے ہی اُسے ہیں جو تجربہ سے براست ثابت ہو۔"

OUT OF WAY LATER DAYS— EINE STAIN NEW YARK

مذہب کو ترک کر کے اہلِ مغرب نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ ذرا ان کے اہلِ علم سے دریافت کیجیے۔ مشہور امریکی نقاد والٹر لپ مین لکھتا ہے:

"تنہا اپنی ذات پر پہلے کبھی ہم نے اتنا انحصار نہ کیا تھا۔ آج کوئی ہمدرد ہماری فکر کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی نمونۂ زندگی بلاچوں وچرا اطاعت کرنے کے لیے اور پیروی کرنے کے لیے ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ کوئی مافوق شارع ہمارے اندر موجود نہیں ہے۔ سب عوام الناس ہیں۔ جن کو دلگداز مصائب اور مشکلات کا سامنا ہے۔ تمام کمزوریاں سطح پر نمایاں ہوگئی ہیں۔ ناقابو یافتہ طبعی قوتیں کبھی خوفزدہ کرتی ہیں اور کبھی ڈھارس بندھاتی ہیں۔

فی الحقیقت ہماری ثقافت گنجلک ہے۔ ہماری تہذیبی اقدار وقتی اور ہنگامی ہیں۔ ہمارے

جذبات جامد سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ شاید ہی کسی ملاح نے کبھی ایسے ناآشنا سمندر میں جہازرانی کی ہو، جیسا کہ بیسوی صدی میں پیدا ہونے والے انسان کو کرنا پڑ رہی ہے۔ ہمارے اسلاف سمجھتے تھے کہ وہ اپنا زندگی کا راستہ پیدائش سے لے کر موت تک جانتے ہیں لیکن ہم پریشان ہیں کہ ہمیں کل کے بعد آنے والے دن کی بھی خبر نہیں۔

مذہب سے آزادی حاصل کرنے کے بعد یہ تمام مصیبتیں شروع ہوتی ہیں۔ مذہب سے آزادی ایک دل خراش چیلنج ہے۔ یہ انسانوں کو رہبر کی رہبری سے اور پادری کی طمانیت سے محروم کر دیتا ہے۔ مذہب کے بت کو پاش پاش کرنے والوں نے ہمیں آزاد نہیں کیا، بلکہ درحقیقت سمندر کی بے رحم موجوں میں پھینک دیا ہے۔ اب ہم خود ہی لمحہ بہ لمحہ بیمار رہے ہیں۔

DRIFT AND MYSTERY- BY WALTER LIPPMAN- P.196-197- NEW YARK

قومیت اور وطنیت وطنیت بھی اہل مغرب کا تحفہ ہے۔ پہلے تو انسانوں کو جوڑنے کے لیے مذہب کا کلمہ جامع ہوتا تھا۔ وحدتِ الٰہ کا نتیجہ وحدتِ آدم اور وحدتِ عالم کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ لیکن جب اہلِ مغرب نے مذہب ترک کر دیا اور مسلک لادینیت اختیار کر لیا۔ تو انسانوں کو مجتمع کرنے کے لیے وطن کے کلمہ مشترک کو استعمال کیا۔ بتدریج قومیت اور وطنیت نے ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ قوم پرستی کے تصور کو عام کرنے میں جرمنی میں نکلٹے (۱۸۹۶-۱۸۳۴) اور ٹریشکے (۱۸۱۴-۱۷۶۲) نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اطالیہ میں مازنی (۱۸۷۲-۱۸۰۵) نے اہم کردار ادا کیا۔ مازنی نے تو قوم کو مظہر الٰہ اور ایک معبود بنا کر پیش کیا۔ سادہ لوح اولادِ آدم اس بت کے بھی پجاری بن گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں بھی قومیت پھیل گئی۔

مگر سوال یہ ہے کہ قومیت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ کیا غیر ہی ظلم کرتے ہیں اپنے ظلم نہیں کرتے؟ کیا اپنے لوگ فرشتے ہوتے ہیں؟ کیا اپنی حکومت میں نیکیاں آسمان سے برستی ہیں؟ جس کسی کو اپنوں کے مظالم دیکھنے ہوں وہ ہٹلر کی جرمنی اور مسولینی کی اطالیہ کا حال پڑھے۔ آلڈوس ہکسلے لکھتا ہے:

"یہ نیا مذہب انسانیت کے درمیان فساد اور تفریق پیدا کرنے کا طاقت ور ذریعہ ہے۔ قومیت اخلاق کی تباہی کا سبب اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت، احترام آدمیت خدائے واحد پر اعتقاد، سب باطل ہو جاتے ہیں۔ ان کی بجائے انانیت اور خود غرضی کے تصورات ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ جو تصادم و پیکار اور نفرت و حقارت کو جنم دیتے ہیں۔"

برٹرنڈ رسل مشہور فلسفی کہتا ہے:

"قومیت نوعِ انسانی کی تباہی کے لیے سب سے بڑی لعنت ہے۔"

دُور افتادہ جزیروں کو چھوڑ کر دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں صرف ایک ہی نسل آباد ہو اور ایک ہی زبان بولی جاتی ہو۔ ہر جگہ مختلف نسلیں اور مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ خود غرضی سے پھر تفریق در تفریق کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ انگلستان میں ویلش، اسکاچ اور آئرش زبانوں کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ فرانس میں پرووِنکل، برلنڈی اور برٹانی زبانوں کی تحریکیں موجود ہیں۔ ہندوستان کے ہر صوبہ میں لسانی تحریکیں چل رہی ہیں۔ بچے ہوئے بنگال میں بھی جھارکھنڈ اور گورکھا لینڈ کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ سندھی میں بھی لاڑ، مفری، وچولو اور سرائیکی کی تفریق موجود ہے۔ خود غرضی تو مختلف راستے نکال لیتی ہے۔ اگر ایک شہر کے لوگ سرکاری ملازمتوں میں زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں تو دوسرے شہر کے لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ جب اغراض کی بھی کوئی حد نہیں ہے تو تفریق کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ پھر انتشار ہی پھیلے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ عدل و انصاف، اخوت و ہمدردی، شفقت و مہربانی عالمِ انسانیت کی دائمی اقدار ہیں۔ ان اقدار کو بنیاد بنا کر ہر قوم اور ہر ملک حق و انصاف اور خیر و فلاح کا معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ مگر ان اقدار پر صرف وہ لوگ عمل پیرا ہو سکتے ہیں، جن کا یوم آخرت پر پختہ ایمان ہو۔ جو خدا ترس ہوں اور متقی ہوں۔ عمل کرنے کے لیے ایک معیاری نمونہ درکار ہے اور وہ ہے حضور اکرم فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور حیاتِ طیبہ۔ بقول سعدی ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید

کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

خدا سے بے نیاز ہو کر انسان خود کو آزاد خود مختار سمجھنے لگتا ہے۔ پھر وہ اس راہ پر چلنے لگتا ہے جس پر چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے نقوشِ پا ثبت ہیں۔ وہ پھر ہرگز اس پہ نہیں چلتا جس پر ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے نقوشِ ثبت ہیں۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کوئی چنگیز خاں اپنی قوم کے لیے رحمت تھا یا عمر فاروقؓ سارے انسانوں کے لیے رحمت تھا۔

پنجاب میں لسانی عصبیّت کی نئی لہر

نعیم صدیقی

چند دن پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب نے گھنٹی بجائی، ملاقات ہوئی، کچھ دیر کے لیے وہ بیٹھے، مبادیاتِ کلام کے بعد کہنے لگے کہ کچھ پوچھ سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ مختصر باتوں کے لیے تھوڑا سا وقت ہے۔

فرمایا: آپ پنجابی کیوں نہیں بولتے؟

یہ ایسا ہی سوال تھا جیسے مجھ سے کوئی پوچھے کہ تم لسی کیوں نہیں پیتے؟ مرتبہ ہلیلہ کیوں نہیں کھاتے؟ پتلون کیوں نہیں پہنتے؟ دھوڑی کے جوتے میں پاؤں کیوں نہیں رکھتے؟ لکھنے پڑھنے کا کام کیوں کرتے ہو؟ کمہار یا ترکھان کیوں نہیں بن جاتے؟ صدیقی کیوں کہلاتے ہو، بھٹی یا ارائیں کیوں نہیں کہلواتے؟

عرض کیا: اس لیے کہ میں دن رات پڑھتا اردو میں ہوں، سوچتا اردو میں ہوں، لکھتا اردو میں ہوں، پشاور اور گلگت سے کراچی اور پیر جو گوٹھ تک، زیارت اور مکران سے لے کر کنجروڑ اور کوٹلی تک بولنے والے آتے ہیں، ان سب سے اردو میں بات کرتا ہوں۔ کیونکہ اگر میں ان سے پنجابی میں بات کروں تو اُن کے پلے کچھ نہ پڑے گا۔ اور وہ سب اگر اپنی اپنی بولیاں بولیں تو میرے پلے کچھ نہ پڑے گا۔ اور پھر اردو ہماری قومی زبان ہے جس کا بینر تحریک پاکستان کے علم کے ساتھ بلند ہوا، اردو ایسی زبان ہے جو برصغیر کی مختلف بولیوں پر مسلمانوں کی آمد اور ان کی تہذیب اور عربی فارسی زبانوں کے اثرات پڑنے سے نمودار ہوئی ہے۔ اردو کو پورے برصغیر میں سمجھا جا سکتا ہے اور اردو میں قدیم و جدید سرمایہ علم و ادب برصغیر کی مروج زبانوں میں سے سب سے زیادہ ہے اور اس میں تیز رفتار نشوونما کارفرما ہے۔

یہ سادہ سی بات دو ثانیوں میں ختم ہو جانی چاہیے تھی، مگر ان حضرت نے کچھ ایسے ٹیڑھے انداز

کی باتیں کیں کہ ایک تو مجھے بہت ذہنی بوجھ محسوس ہوا، دوسرے یہ اندیشہ ہوا کہ تخریبی خطرات کی وہی لہر اب مخالفِ اسلام و پاکستان قوتیں یہاں بھی لے آئی ہیں جو پہلے سندھ میں دھیمی دھیمی اُٹھتی رہی اور پھر کراچی میں پہنچ کر تباہی کا طوفان بن گئی۔

اب تک علاقائیت اور نسلیت اور لسانیت کے پاکستان شکن فتنوں کو توڑنے میں پنجاب کی قربانیوں اور اُس کی چٹان جیسی استقامت کو دخل تھا کہ وہ نہلے کے مقابلے میں دہلا لے کے نہیں اُٹھا تھا، لیکن اب طوفان روکنے والی اس چٹان کو سیلاب اکھیڑ کر بہا لے جانا چاہتا ہے۔

تمام زبانیں خدا کی عطا ہیں۔ اختلافِ اَلسنہ کو اُس نے نشاناتِ قدرت میں سے شمار کیا ہے۔ تمام زبانیں مجھے اور ہر مسلمان اور انسان کو یکساں عزیز ہونی چاہییں۔ تمام زبانیں انسانوں کی خادم ہیں اور ان کی ضرورتِ اظہار کو پورا کرتی ہیں۔ ہر زبان سے استفادہ کرنے کے لیے دل کھلے رکھنے چاہییں۔ مگر دُنیا کے کچھ نظریات اور تحریکوں نے انسانوں کو انسانوں سے لڑا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے بارہا زبان کو پہلے سوشل مسئلہ بنایا اور پھر سوشل مسئلے کو سیاسی ہتھیار، اور پھر اس ہتھیار سے ان حقیقتوں کو گھائل کر دیا جو انسانیت کا بچاؤ کرنے والی تھیں اور پھر خود انسانیت کے ہر پیکر کو لہولہو کر دیا۔ لسانی تلواروں نے زمینوں اور ملکوں اور معاشروں کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ سچ ہے کہ الٰہی کلمۂ جامعہ کے علاوہ جتنے بھی داعیہ ہائے اجتماع ہیں وہ درحقیقت انسانوں کو انسانوں سے کاٹتے اور زمین پر تباہی پھیلاتے ہیں۔

ہاں تو پنجابی زبان ایک زبان ہے، بہت اچھی زبان ہے، بڑی آبادی اسے بولتی ہے۔ اس زبان کی ترقی کے لیے ایک معصومانہ مزاج کی تحریک چلی جس کے زیرِ اثر پنجابی میں افسانے اور غزلیں تک لکھنے کے تجربات ہونے لگے۔ ادبی حلقے سے پوسٹ گریجوایٹ امتحانات کا سلسلہ چلا۔ یہاں تک تو خیر پنجابی زبان کا کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا۔ مگر ادھر کچھ پہلے ایک اجتماع ایسا ہوا جس کی

باہر آنے والی جھلکیوں سے پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ اب مسئلۂ زبان کی سیاسی تلوار بننے لگی ہے — حنیف رامے صاحب کی کتاب نے اس مسئلے پر ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ اب پھر ایک تازہ اجتماع ہوا ہے جس میں نثار محی الدین، مسعود ثاقب، ریٹائرڈ کرنل نادر، آصف خاں، سلیم جہانگیر، شاہین ملک، سبط حسن ضیغم، شفقت تنویر مرزا، آفتاب نوید، عین الحق فرید کوٹی، عباس علی، شارب انصاری اور احمد بشیر نے خطاب کیا۔ (مطابق رپورٹ روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۸۶ء)۔

اس اجتماع کی کارروائی کی اخباری تلخیص پڑھ کر اندازہ ہوا کہ پنجابی زبان کی سیاسی ہتھیار بنانے والی "واہ فیکٹری" کھل گئی ہے۔ اور اب نہ جانے کن کن مسلمانوں کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی گردنیں کٹنے والی ہیں۔ اور گھر اور دکانیں تباہی کا لقمہ بننے والے ہیں۔ (اللہ سب کو بچائے) اب تخریب کاری کا نعرہ لگانے والی کسی قوت نے پاکستان کے دل و جگر پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔

مذکرہ اجتماع کی کارروائی سامنے آنے پر روزنامہ وفاق نے پُراضطراب دل کے ساتھ جو نوٹ لکھا۔ اس کی تلخیص درج ذیل ہے:

"پاکستان کے المیوں یا پُراسرار معاملات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صنعت کار (مراد ہیں: نصیر اے شیخ) دانشور، محقق اور مؤرخ بن بیٹھے ہیں۔ اور وہ حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت میاں میرؒ، قائد اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ پر فخر کرنے کے بجائے رنجیت سنگھ پر فخر کرتے ہیں"......

"ایک صنعت کار کے دل میں اپنی زبان کا درد اچانک کیوں جاگ اٹھا" ....

"ہم دو قومی نظریوں کے ماننے والے ہیں۔ جن لوگوں نے پنجاب کا نام استعمال کر کے لسانی تعصب پیدا کرنے کی ناکام سعی کی ہے، وہ پنجاب کے نمائندے نہیں ہیں۔ ان کا اضطراب ان مجاہدوں کی کامیابیوں کا نتیجہ ہے جو افغانستان میں روسی سامراج کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ یہ لوگ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کی تعلیمات کے منافی باتیں کہہ رہے ہیں"۔

امیرِ جماعتِ اسلامی صوبہ پنجاب نے اپنا ردِ عمل ایک تقریر میں ظاہر کیا:

" پنجابی پرچار کمیٹی کی جانب سے لاہور میں منعقدہ سیمینار میں مقررین کے خیالات کی بالعموم اور نصیر اے شیخ کے اُن خیالات کی بالخصوص شدید مذمت کی ضرورت ہے، جس میں اُنہوں نے محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کو قاتل اور جارح قرار دیا ہے۔ سیکولر اور لادین عناصر ملتِ مسلمہ کی یک جہتی کو خاک میں ملانے کے لیے علاقائی، لسانی اور نسلی تعصبات کو بھڑکانے میں اتنے اندھے ہوگئے ہیں کہ ہمارے محسنوں کو قاتل بنا کر رکھ دیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی اور محمود غزنوی نے مسلمانانِ ہند کو کفار و مشرکین کی غلامی سے نکال کر حقیقی آزادی سے بہرہ مند کیا تھا .... ان خیالات کے حامل افراد ملک کے باقی صوبوں میں پھیلے ہوئے نسلی اور لسانی تعصبات کو پنجاب میں بھی پھیلانا چاہتے ہیں .... اہلِ پنجاب ہمیشہ مملکتِ خداداد میں وحدتِ ملی اور یک جہتی کی مثال رہے ہیں اور آئندہ بھی وہ پنجابی اور غیر پنجابی کے تعصب کو خاطر میں نہیں لائیں گے"۔

اب کچھ تاثرات اور جوابی دلائل مجھے بھی عرض کرنے ہیں:

نصیر اے شیخ صاحب جس پنجابی پرچار کمیٹی کے سیمینار کی بارات کے دولہا تھے، اول تو مجھے ان سے پوچھنا ہے کہ شرکا کے اسمائے گرامی میں کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کو علمی، دینی اور اخلاقی لحاظ سے کوئی مقام حاصل ہو۔ اور نہ انہوں نے خدا اور رسولؐ تو کیا، قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ سے کوئی تعلق ظاہر کیا۔ ایسی خود رو شخصیتوں کو جن کا تعلق ہمارے عقائد و تہذیب کی سر زمین سے نہ ہو، ہم کیسے یہ حق دے دیں کہ وہ ہماری زندگی کی کسی بھی درجے میں نمائندگی کریں یا ہمیں درسِ ہدایت دیں۔ ان لوگوں کے چھوٹے پن کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف ہمارے اکابرِ تاریخ سے قطع تعلق کا اظہار کیا بلکہ ان کو گالیاں تک دیں، یعنی قاتل اور جارح کے خطاب دیے۔ گویا کسی عدالت یا کمیشن کا اجلاس تھا جو تاریخ کے تمام معاملات پر فیصلہ دینے کے لیے بیٹھی تھی۔

میں تو نصیر اے شیخ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا وہ صاف ظاہر کر دیں گے کہ ان میں کمیونسٹ،

سوشلسٹ، سیکولرسٹ اور قادیانی (ظاہری قادیانی بھی اور مخفی قادیانی بھی)، کون کون تھا۔ اور کیا کوئی ایسا شخص بھی تھا جو یہ سب کچھ نہ ہو؟

رنجیت سنگھ کی حکومت پر فخر ہے، کیونکہ یہ حکومت "پنجابی" تھی۔ یعنی کل بھی اگر کوئی پنجابی برادری یا پنجابی جاگیرداروں یا پنجابی تخریب کاروں یا اسلام کے پنجابی دشمنوں کا کوئی گروہ یہاں حکمران ہو کر خوب ظلم و استبداد ڈھائے تو اس کی حکومت قابلِ فخر ہوگی۔ شاید نصیر اے شیخ اور ان کے پنجابیت پرست تخریبی نقارچیوں کے یاد نہیں کہ بادشاہی مسجد پر کیا گذری۔ اور عوام میں "سکھا شاہی" کی اصطلاح کیوں اتنی مقبول ہوئی کہ آج بھی محاورہ و تمثیل کے طور پر بولی سمجھی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ اصطلاح دہلی و لکھنو میں اُردو نے نہیں بنائی، یہ پنجاب ہی میں وضع ہوئی۔ نصیر اے شیخ صاحب کو معلوم ہے کہ دینِ پنجابیت کے ضمنیاتِ شخصیات میں رنجیت[1] سنگھ کے ساتھ دلا بھٹی اور مرزا غلام احمد قادیانی بھی دوش بدوش ہیں۔ یہ ہیں پنجاب کے روشن ستارے۔

آپ اپنے ستاروں کو چومیں یا سجدہ کریں، سوال یہ ہے کہ دوسروں کی تاریخی شخصیتوں پہ کیچڑ اچھالنے والے آپ کون ہوتے ہیں۔ یہاں کی تاریخ اگر آپ نے پڑھی ہوتی تو آپ کو معلوم ہوتا کہ مسلمانوں پہ ہندوؤں، برہمنوں اور مرہٹوں کی جبریتوں اور سازشوں کے تحت کیا مصیبتیں درپیش تھیں۔ جن سے اُن کو نکالنے کے لیے احمد شاہ ابدالی اور دوسروں نے حملے کیے۔ محمود غزنوی قرامطہ اور ملاحدہ کے تعاقب میں ہندوستان آیا اور ہندوؤں کی پناہ سے ان کو نکالا، کیونکہ وہ پوری ملتِ اسلامیہ کے مجرم تھے اور ان کے گروہ نے بے شمار علمائے حق کو دھوکے اور خفیہ طریقوں سے قتل کرایا تھا۔ یہاں پہنچ کر جب خود یہاں کے ستائے اور پسے ہوئے ہندوؤں ہی سے اسے معلوم ہوا کہ سومنات نہ صرف ہندوؤں کے جنگی جنون کا مرکز بنا ہوا اور ملاحدہ بھی ان کے ساتھ شامل ہیں، بلکہ برہمنوں اور پروہتوں اور پجاریوں نے لوگوں سے مورتیوں کے چڑھاووں کی شکل میں انباروں دولت جمع کر رکھی ہے۔ یہ دولت نہ صرف ظالم قوتوں نے گائے جیسے مظلوم و مسکین عقیدت مندوں کے تھنوں سے نچوڑی تھی، بلکہ اس کا ایک مصرف جہاں اُن کے ذاتی عیش و آرام

---

[1] جب آپ رنجیت سنگھ کا جھنڈا اٹھائیں گے تو سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید کا کیا مقام ہوگا؟ (مدیر)

کی تکمیل تھا - دوسرا مقصد مسلمانوں کے خلاف اس دولت کی قوت کو استعمال کر کے انہیں تباہ کرنا بھی تھا -

ایسے گھمن چکر کو محمود غزنوی نے توڑ کر ہندوستان اور افغانستان کے مسلمانوں کو بچانے کا فرض ادا کیا - نیز ہندوؤں کے اکابر بُت پرستانہ نظام کے ذریعے اندھا دھند جو کمائیاں عوام سے نچوڑ کر جمع کر چکے تھے - ان سے مذہبی رسہ گیروں کو محروم کیا - ورنہ اس نے اپنی ذاتی مفاد کے لیے نہ تو فوجی اقدام ہی کیا تھا اور نہ سومنات کی طلسم شکنی کا کام -

آپ اسے لٹیروں میں شامل کرتے ہیں، تو پھر یہاں کے برہمن اور پروہت اور پجاری اور ان سے تال میل رکھنے والے راجا لوگ لٹیرے اور قاتل نہیں بلکہ انسانیت کے بڑے خادم اور سب سے آفاقی محبت رکھنے والے تھے - غالباً رنجیت سنگھ اور ڈلہوزی اور مرزا غلام احمد قادیانی بھی بڑے مسکین اور ایثار کیش خادمانِ انسانیت کی مثلث تھی -

سندھ میں آواز اُٹھتی ہے (بہت پہلے) کہ محمد بن قاسم لٹیرا تھا — جس نے برہمنوں اور راجاؤں کے دو پاٹوں میں پستے ہوئے عوام کو پہلی بار آزادی اور رشد و ہدایت کی راہ دکھائی تھی - اب ادھر پنجاب سے آواز اُٹھتی ہے کہ احمد شاہ ابدالی اور محمود غزنوی لٹیرے اور قاتل تھے - کیا ان آوازوں میں کوئی رشتہ نہیں ہے - سندھ کا لسان پرست اور پنجاب کا لسان پرست آپس میں بھائی بھائی ہیں جس طرح سندھ کا تخریب کار اور پنجاب کا تخریب کار بھائی بھائی ہیں - سندھ کا عملی مسلمان اور پنجاب کا عملی مسلمان ایک ہیں - سندھ کا مذہب دشمن اور پنجاب کا مذہب دشمن ایک ہیں - اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اجتماع اور یکتائی اور نوعیت زبان سے نہیں، طرزِ فکر سے بنتی ہے -

بہر حال نصیر اے شیخ اور ان کے ہم گروہ یہ بتائیں کہ انہوں نے کیسے فرض کر لیا ہے کہ ہماری جو شاخیں چودہ سو سالہ تاریخ میں پھیلی ہوئی ہیں وہ سب کٹ جائیں - اور عقائد و اخلاق کی جو جڑیں کتاب و سنت تک پہنچتی ہیں وہ نوچ ڈالی جائیں، دوسرے لفظوں میں ہم اپنی چودہ صدیوں کو یہ کہہ کر کہ ہمارے تمام بادشاہ، تمام علماء، محدثین و مفسرین، مصلحین، اولیاء (نعوذ باللہ شیخ صاحب کی ذہنیت کے لحاظ سے لٹیرے تھے) اور ان سب کے مقابلے میں رنجیت سنگھ اور مرزا قادیانی اور

ڈلا بھٹی سچے ہیرو اور بڑے مقدس لوگ ہیں۔

پاکستانی قوم غلط حکومتوں اور غلط حالات سے دوچار رہنے اور اصل مقصد کو گم کر کے پست اور ادنیٰ مقاصد میں برسوں مبتلا رہنے اور اخلاقی طور پر شدید و بازدہ ہونے کے بعد جس فرسٹریشن سے دوچار ہے، اسی کا نتیجہ ہیں علاقوں اور صوبوں کی علیحدگی اور علاقائی زبانوں کی برتری اور نسلی اہمیت کے نعرے۔ یعنی قوم نے دشمنوں کی خواہش اور کوشش کے مطابق اب افتراق و انشقاق کی راہ اختیار کر لی ہے اور خود ہی آپس میں ایک دوسرے کی تباہی کے سامان کر رہی ہے۔ کراچی کے رنجیدہ اور شرمناک واقعات و احوال اس کی ایک واضح مثال ہیں۔ تفریق اور تعصب کے نعروں سے ایسے ہی تصادم جگہ جگہ پیدا ہوں گے اور زور پکڑیں گے۔

اگر حکومت کے پاس ان فتنہ ہائے ہلاکت کو روکنے کے لیے تحفظ پاکستان و نظریہ پاکستان کا کوئی قانون نہیں اور اب بھی کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا جس کے تحت فوجداری مقدمات چلائے جا سکیں، نیز اس جرأت مندانہ کام کے لیے فوری کارروائی کرنے کی جرأت نہیں تو کم سے کم ثقہ سیاسی لیڈروں، دینی عالموں، شرافت پسند اساتذہ، مسلم دانشوروں، خدا پرست ادیبوں، نیک نہاد طلبہ اور قومی ذرائع ابلاغ کے کارپردازوں میں سے جن کے ایمان و ضمیر زندہ ہوں وہ پیش آمدہ طوفان بلا کا اس شدت سے مقابلہ کریں کہ ان کی موجوں کے نہ صرف رُخ پھیر دیں، بلکہ نہ ولی خاں کو، نہ جی ایم سید کو، نہ الطاف حسین مہاجر کو اور نہ نصیر اے شیخ کو آئندہ اس کی جرأت ہو کہ وہ اسلام یا پاکستان یا نظریۂ پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کریں۔ پاکستان ایک زندہ قوم کا ملک ہے، یہ پاگل خانہ نہیں ہے کہ اس میں بے تکی بولیاں بولی جائیں اور بے سُری آوازیں نکالی جائیں۔ اور دینی برتری، قومی وحدت، ملکی سالمیت اور افراد کی شرافت کی دھجیاں بکھیرنے کی جرأت کی جائے — یہاں رسولِؐ پاک اور خلفائے راشدینؓ کے بعد اُمت کے جملہ ائمہ ہدایت، برصغیر کے حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، محمد علی جوہرؒ، قائداعظمؒ، علامہ اقبالؒ اور سید مودودیؒ کے افکار اور تعلیمات اور خدمات پر اگر کوئی خطِ نسخ کھینچنے کی کوشش کرے گا تو وہ نہ پاکستانی ہے اور نہ اس سرزمین کی کمائی کھانے اور اس کی ہوا میں سانس لینے کا اُسے حق پہنچتا ہے۔ وہ ہمارے دین، اور ہمارے بزرگان و اکابر اور ہماری تاریخ اور نظریہ پاکستان اور ریاست پاکستان

کے خلاف جارحانہ جنگ کرتا ہے اور ہمارے ملی وجود کے خلاف چڑھائی کرتا ہے۔ اس شعور کے ساتھ ہر مسلمان کو اس کی حرکات و سکنات اور تحریر و تقریر کو دیکھنا چاہیے۔

آپ لوگ اپنے اس ذہنی تضاد کو نہیں زیر توجہ لاسکے کہ اس جوش و خروش سے پنجابیت کا علم اُٹھانے کے بعد آپ رسم الخط رومن سات سمندر پار سے مستعار لائیں گے۔ کیا وہاں بھی کوئی پنجابی ہی کا دوسرا خط ہے؟ غور فرمایئے کہ آپ کی ساری زندگی پر مغربیت کا تسلط ہے۔ آپ کے نظریات و تصورات، آپ کی سیاست، آپ کی صحافت، آپ کی معاشرت، آپ کی تحریکِ خواتین (یا ٹمیارنز نجن) آپ کا قانون، آپ کا آرٹ، آپ کا لباس، آپ کی تقریبات اور تفریحات سب کچھ غیروں کا ہے۔ ایک بیرونی تہذیب کی سامراجیت کی گاڑی آپ کھینچتے پھرتے ہیں، اس کے بعد آپ اُردو بولیں تو کیا اور پنجابی یا سندھی بولیں تو کیا؟ کیا اس سے وہ سامراجیت کمزور پڑ جائے گی یا لسانی افتراق اور ساتھ ہی علاقوں کے ثقافتی افتراقات کے ساتھ اور بڑھے گی۔

ایسا مقابلہ کرنے کی قوت اُردو میں تھی، مگر اُردو کو تو ہمارے بڑوں کی غلامانہ ذہنیت نے اسے پست کر کے انگریزی کو اس کی گردن پر سوار کر رکھا ہے۔ اب ہماری نجات دہندگی کا جو کام وسیع سرمایہ رکھنے والی اُردو نہ کر سکی، اُسے کوئی علاقائی زبان کیا کرے گی، اُلٹا صیاد کے اقبال کے جال کے حلقے اور کس جائیں گے۔ آپ کی تو سرے سے توجہ ہی اس مسئلے پر نہیں کہ آپ پنجاب یا پاکستان کو مغرب کے فکری، ثقافتی اور تہذیبی پھندوں سے آزاد کرائیں۔ آپ تو صرف اُردو زبان سے آزادی کے خواہشمند ہیں۔ گویا اُردو سے آزادی کے ساتھ مغرب کی اور زیادہ کڑی غلامی ——— کیونکہ اُردو نے مغربی امپیریلزم اور مغربی تہذیب اور مغربی سامراج کے خلاف جو سرمایۂ فکر تیار کیا، اس کا عشرِ عشیر بھی کسی علاقائی زبان میں نہیں ہے۔

پنجابی؟ ـــ مگر کون سی پنجابی؟ ـــ پوٹھواری؟ ہندکو؟ دھنوچی؟ تپتے والی؟ گجراتی؟ لاہوری؟ سرائیکی، ملتانی؟

آج جس اصول کا نشہ آپ پیدا کر رہے ہیں، اُسی کی ترنگ جب بڑھے گی تو آپ دیکھیں گے کہ پنجابی کی ہر بڑی شاخ اپنے آپ کو علیحدہ کرنا چاہے گی۔ کیونکہ کچھ لوگوں کو لیڈرشپ اسی طرح مل سکتی ہے۔

چنانچہ سرائیکی کی علیحدگی کا آوازہ تو پہلے ہی اُٹھ چکا ہے۔ کسی قدر ملتانی کے لیے بھی ایسی ہی سرگوشیاں سُنائی دیتی ہیں، اگر دلِ صد برگ ہزارہ ہونے چلا تو کس دلیل سے روکیئے گا۔

آپ لوگوں نے کئی باتیں ایسی کہی ہیں جن کا تعلق لسانی مسئلے سے نہیں ہے۔ مثلاً علی عباس جلالپوری کا علاج حکومت کو کروانا چاہئے، ڈاکٹر مبشر حسن کی اپنی حکومت نے بلوچوں پر ظلم کیا، ہر سال ۸ لاکھ پنجابی بچے اس لیے سکول چھوڑ جاتے ہیں کہ انہیں مادری زبان میں تعلیم نہیں دی جاتی۔ (اس قسم کا کوئی مطالبہ یا آوازہ پہلے تو کبھی نہ سُنا تھا) وغیرہ۔

اِن میں سے ہم صرف ایک مبحث کو لینا چاہتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ "مذہب کی بنیاد پر کوئی قوم نہیں بن سکتی"۔ تو پھر کس بنیاد پر بن سکتی ہے؟ آپ کہیں گے: زبان کی بنیاد پر! تو جناب سے سوال یہ ہے کہ ایک ہی زبان بولنے والے انگلستان میں سکاٹ لینڈ کی علیحدگی کی پُرہنگامہ تحریک برسوں سے کیوں چل رہی ہے؟ مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی کی زبان تو ایک تھی، مگر اب سفر متضاد سمتوں میں ہے۔ بنگلہ دیش اور مغربی بنگال کی زبان ایک ہے، مگر دونوں میں سخت عناد ہے۔

کہنا مجھے یہ ہے کہ سابق لمبی تاریخ پڑھنے میں آپ کو دشواری ہوگی، آج کی تاریخ یہ ہے کہ بھارت میں مسلمان مذہب کی بنیاد پر ایک جمعیت ہیں۔ اور ہندوازم کے تعصب کا بھوت ان کو بودھوں کی طرح نگل لینا چاہتا ہے۔ مصر، سوڈان، نائیجیریا وغیرہ علاقوں میں عیسائی کمیونٹی مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان میں رکھ کر اپنا تسلط بڑھانا چاہتی ہے۔ شام میں اسلام کو مسیح

کہنے والے دروزیوں نے سنی مسلمانوں کو کچلنے میں کئی برس سے بد ترین مظالم کیے ہیں۔ روس اور یوگوسلافیہ اور ایسے ہی اور علاقوں میں مسلمانوں کو اسلام سے دور ہٹانے کے لیے مذہب کے خلاف جنگ جاری ہے۔ آسام اور برما سے خصوصاً مسلمانوں کو نکالا جا رہا ہے کسی دوسرے مذہب والے کو نہیں۔ فلسطین میں مذہب کی بنیاد پر ایک قوم اور ایک ریاست قائم ہے۔ فلپائن اور اریٹیریا جیسے ملکوں میں مسلمان ظلم سہتے سہتے آخر جانبازی پر اتر آئے اور اب ان کا مطالبہ ہے کہ انہیں ملک میں سے ان کا حصہ الگ کر دیا جائے۔ مغرب والے جدید تحریکاتِ اسلام سے کیوں گھبرائے ہوئے ہیں اور ان پر کثیر لٹریچر کیوں شائع ہو رہا ہے۔ یہاں پاکستان میں ایک طرف قادیانی اقلیت ہے جو مذہبی دائرہ وسیع کر کے اور مختلف محکموں میں نفوذ پا کر یہاں کی حکومت پر قبضہ کرنا چاہتی رہی ہے یا اثر انداز ہونے کی خواہش مند رہی ہے، دوسری طرف عیسائی مشن اور ان کی درس گاہیں اور ہسپتال ہیں جو تیزی سے ایک طرف ہمیں مغرب کی ثقافتی غلامی کی جھیل میں ڈبو رہے ہیں، دوسری طرف عیسائیت کے انجکشن لگا رہے ہیں، اور تیسری طرف ہماری آئندہ نسلوں کو ان کے عقیدوں اور مقاصد اور روایات و اقدار سے اکھیڑ رہے ہیں۔ یہ سب مذہبی ثاقفت ہے۔ اسرائیل اور بھارت اور روس کا پاکستان سے عناد اسی سبب سے ہے کہ:

"اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں"

دوسروں کے ہاں تو مذاہب ہیں جو اتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس "دین" ہے یعنی اُسے عقائد، افکار، اخلاق، سیاست و معیشت اور قانون، اور اقدار کا ایک مکمل تہذیبی نظام کہنا چاہیے۔

ایسا نظام کسی لسانی یا علاقائی یا نسلی یا خاندانی نعرے کو سن کر رک نہیں سکتا۔ وہ تو زور شور سے آگے بڑھے گا اور اس کی حمایت اردو والے بھی اور پنجابی والے بھی اور دوسری زبانوں اور نسلوں اور علاقوں والے بھی کریں گے۔

یہ "ماں سے بے وفائی" والی بات آپ نے کہاں سے اُڑائی۔ قرآن کی کس آیت میں ہے؟

حدیث کی کسی روایت میں ہے؟ ہمارے اکابر و اسلاف اور علماء و مفکرین اور اولیاء کے اقوال میں ہے؟

آپ جیسے حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ بھارتی علمِ صنمیات نے بہت سی ماؤں کا تصور انسان کو دیا ہے۔ بھارت بھی ماتا ہیں، گئو بھی ماتا ہیں، کالی بھی ماتا ہیں، چیچک بھی ماتا ہیں۔ پنجابی تہذیب میں بھی شاید ایسا کوئی علم صنمیات نہیں ہے۔ اگر وارث شاہ اور میاں محمد نے ماتا یا ماں کا تصور زمین یا وطن کو دیا ہے تو اگرچہ اسلام کے مقابلے میں وہ بھی سند نہیں، پھر بھی سامنے لایئے سلطان باہو، بلھے شاہ، شاہ مراد، اور دوسرے صوفیاء و مجذوب حضرات کا کلام بھی رکھا جائے۔

اسلام بتوں کے بھی خلاف ہے۔ صنمیات کے آئینے میں حقائق کو دیکھنے دکھانے کا طریقہ بھی اسے پسند نہیں، وطن یا قوم یا ملت یا خاندان میں سے کسی چیز کو اس نے انسانوں کے لیے ماں یا باپ قرار نہیں دیا۔ اور نہ ماں کے حقوق اس کے متعلق کیے ہیں۔

یہاں پھر بھارت کے مذہبی طرزِ فکر کی غلامی کی جا رہی ہے۔ آپ ہم پنجابیوں، خصوصاً مسلمانوں کو اس غلامی سے آزاد ہی رہنے دیں۔

جب آپ کسی نظامِ فکر میں "ماں" کا تصور لائیں گے تو پھر آپ کو کوئی باپ بھی تلاش کرنا ہوگا، بلکہ بھائی بہن بھی۔

بغیر سوچے انوکھی باتیں کہہ دینا کسی بھی تعلیم یافتہ آدمی کو زیب نہیں دیتا۔

دیکھیے نصیر اے شیخ صاحب و دیگر حضرات! اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کو امن و انصاف کیسے ملے، اس کے لیے دوسرا ضمنی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسان راستی، دیانت اور خدمت کا پیکر کیسے بنے؟ ـــــ اور یہ سوال تو آپ نے اٹھایا ہی نہیں۔

سوچیے کہ کیا یہ مطلوب انگریزی یا اردو یا سندھی یا پشتو بولنے سے حاصل ہو سکتا ہے؟ اس کے لیے تو ایک ہی راستہ ہے کہ خدا کی کائنات میں اسی کو رب و الٰہ مان کر اس کے رسول کو رہبر تسلیم کیا جائے۔ اور اس کی کتابِ مقدس کو شمعِ ہدایت بنایا جائے۔

اِس طرح کا آدمی سرحد میں ہو یا پنجاب میں یا سندھ میں ـــــ انگلستان کا ہو یا جرمنی کا؟ فارسی بولے یا سواحلی، حبشی ہو یا رُومی، وہ سب ایک گروہ اور ایک پارٹی ہیں ـــ سچائی، امن اور خدمت کے سپاہیوں کی پارٹی ـ اور جو لوگ اس راستے کے خلاف ہوں، وہ سب کے سب دوسری پارٹی ـ

براہِ کرم اس اصل مسئلے پہ آیئے جس کا حل دُنیا کو نہیں مِل رہا ـ

کیا وہ حل کسی خاص زبان کا بولنا ہے؟

(تفہیم حکمتِ سیّد مودودیؒ)

کو کاٹ کھاتی ہو؟

جواب: جب آپ دیکھیں کہ بات کاٹ کھاتی ہے تو جان لیں کہ ایسی حالت میں بار بار اصرار کر کے بات کہنا اُلٹا ضد پیدا کرے گا ـ بہتر طریقہ یہ ہے کہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر اسے سمجھایا جائے کہ تمہیں اپنے دین کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کرنی چاہیے ـ یعنی آپ بات کو اس نکتہ سے شروع کریں کہ وہ دین سے آگاہ ہونے کی ضرورت محسوس کرے اور اگر وہ اس ضرورت کو محسوس کرلے تو اُسے دینی لٹریچر میں سے مناسب کتابوں کا مطالعہ کرائیں ـ بعض زبانی بحث سے آدمی ضد میں مبتلا ہو جاتا ہے ـ جب وہ کسی وقت بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے پڑھتا ہے تو ـــ وہ ان چیزوں کو قبول کر لیتا ہے جنہیں وہ زبانی گفتگو میں قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ـ ماخوذ از "ذکریٰ" رام پور انڈیا ـ

رسائل و مسائل

فرضیتِ علم اور اعمال کی جزا و سزا

مسرت کی بات ہے کہ ہم ایک ایسا سوال و جواب شائع کر رہے ہیں جس کے مجیب ہمارے دیرینہ تحریکی رفیق، فاضل دانشور اور میرے ذاتی دوست مولانا صدرالدین اصلاحی (انڈیا) ہیں۔

محترم مولانا نعیم صدیقی صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ ترجمان القرآن مطالعہ میں رہتا ہے۔ آپ کے ذریعہ مولانا مودودیؒ کی یاد تازہ ہے۔ یہاں مطالعۂ قرآن کے موقع پر کچھ سوالات زیر بحث آئے تھے۔ ان کی عمومیت نے مجھے مجبور کیا کہ اس سلسلے میں اہلِ علم سے استفادہ کیا جائے، چنانچہ مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کو زحمت دی۔ انہوں نے ازراہِ عنایت اس کا جواب ارسال فرمایا ہے۔ وہ خط بعینہٖ آپ کو روانہ کر رہا ہوں تاکہ آپ کو اپنے دیرینہ رفیق کی صحت وغیرہ سے متعلق معلومات ہو جائیں۔ اگر افادہ عام کے لیے مناسب خیال کریں تو اس جواب کو سوالات کے ساتھ شائع فرما دیں۔ سوالات یہ تھے:

سوالات: نمبرا۔ مشہور حدیث "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم" کے سلسلے میں بعض علماء دنیاوی علوم کو بھی شامل کرتے ہیں۔ یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟ حدیث سے تو علمِ دین کی فرضیت کا مفہوم نکلتا ہے۔ اگر اس کے علاوہ طبعی علوم کو بھی فرض قرار دیا

جائے تو پھر   شرعی کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے؟

سوال نمبر ۲ :- جنت کے لالچ اور دوزخ کے خوف سے عبادت نہیں کرنی چاہیے مستشرقین نے یہ الزام لگایا ہے کہ قرآن نے لالچ دے کر صحابہ کرام کو ابھارا تھا۔ کیا جنت کے حصول اور دوزخ سے بچنے کے لیے دعوت دینا غلط ہوگا؟ جب کہ قرآن بالصراحت اس انداز سے دعوت دیتا ہے۔

گو مولانا محترم کے جوابات مختصر ہیں، مگر واضح ہیں، اگر آپ بھی اس پر اظہار خیال کی ضرورت محسوس کرتے ہوں تو مزید روشنی ڈالیے کیونکہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس طرح کے سوالات سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ باقی حالات لائق تشکر۔ تمام احباب و رفقاء کو سلام۔

(ابوالاکرم - دوحہ، قطر)

جواب :- پھول پور، اعظم گڑھ - ۲۳ دسمبر

برادر عزیز!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ دعا ہے کہ آپ مع احباب بخیر و عافیت ہوں۔

ہفتہ عشرہ قبل آپ کا خط ملا۔ خیریت معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے۔

میری صحت عمر کے ساتھ ساتھ، برابر ضعف و اضمحلال کی زیادتی سے دوچار ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ تقریباً دو سال سے مطالعہ اور سنجیدہ علمی تحریری خدمت سے بھی کنارہ کشی سی اختیار کر لی ہے۔ اور اب کسی دُور کے مقام، مثلاً دہلی وغیرہ کے سفر کی بھی ہمت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ ادھر تو کوئی دو ماہ سے رہ رہ کر وقتی بیماری کا بھی شکار رہا ہوں۔ اب جا کر طبیعت قدرے سنبھلی ہے۔

علالت اور ضعف و اضمحلال کے ساتھ ساتھ ذہن بھی بعض خانگی مسائل کی اُلجھنوں سے کچھ پریشان پریشان سا رہتا ہے۔ اس لیے بھی کچھ لکھنے پڑھنے کی طرف میلان نہیں ہو پاتا۔

آپ نے حدیث "طلب العلم فریضة" کے بارے میں میری رائے دریافت کی ہے۔ بات بہت واضح ہے "العلم" قرآن اور حدیث کی ایک اصطلاح ہے، اور جب کتاب یا سنت میں اس اصطلاح کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد مروجہ علم و سائنس نہیں، بلکہ علمِ دین اور معرفتِ حق ہی ہوا کرتی ہے، البتہ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ وہ علوم بھی، جنہیں دُنیوی علوم کہا جاتا ہے، مسلمان کے لیے غیر مطلوب

نہیں ہیں، بلکہ مصالحِ دین و ملّت کا تقاضا اگر ہو تو اُن کی تحصیل ضروری ہو جاتی ہے، جیسا کہ اس دور میں فی الواقع ہو چکی ہے۔ پھر علومِ طبعی کے حصول کا ایک پہلو اور بھی بڑا اہم ہے، اگر ان علوم کے نتیجے میں حق کی معرفت بھی حاصل ہو تو دُنیوی، ہونے کے باوجود ان کی اہمیت اور افادیت اور حیثیت دینی بن جاتی ہے۔ قرآن مجید میں زمین و آسمان اور دیگر مخلوقات پر غور و فکر کرنے کی جو ترغیب اور تلقین پائی جاتی ہے، اُس کی غرض و غایتِ اصلی یہی معرفتِ حق ہے۔ تمدنی، اقتصادی اور علمی و فکری فوائد بالکل ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔

دوسرا سوال جنت و دوزخ کو سامنے رکھ کر عبادت کرنے سے متعلق ہے۔ ہمارے صوفیا ایسا ہی فرماتے ہیں کہ جنت کے لالچ یا دوزخ کے خوف سے خدا کی عبادت نہیں کرنی چاہیے، مگر قرآن اور سنت سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ جس کو اللہ کی عبادت کرنی ہو اور اس کا عبد بن کر رہنا ہو اُسے اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی حدیث ہی کی بات ماننی چاہیے۔ جواب دہی اللہ رب العالمین کے سامنے کرنی ہے، صوفیا، یا مستشرقین کے سامنے نہیں۔

ایک صاحب کے خط سے ہفتہ عشرہ قبل یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ مولانا حامد علی صاحب گھٹنوں کے شدید درد میں مبتلا رہے ہیں، البتہ اب افاقہ ہے اور چھڑی کے سہارے چل لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ شفا دے۔

والسلام

صدرالدین اصلاحی

مطبوعات

مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات | تالیف: پروفیسر سید محمد سلیم۔ ناشر: ادارۂ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان۔ ۸ سراے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔ کاغذ طباعت خوب، رنگین دبیز سرورق۔ صفحات: ۱۶۰، قیمت: -/۱۵ روپے

پروفیسر سید محمد سلیم صاحب کو اللہ تعالیٰ نے سچے دینی شعور کے ساتھ جو ذوقِ تاریخ اور حافظہ و تخلیق کی جو قوتیں عطا کی ہیں اُن کے ثمرات سامنے آتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی تازہ تالیف بہ عنوانِ بالا سامنے ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر آپ کو اپنی تاریخ پہلے سے بڑھ کر قابلِ فخر محسوس ہوگی۔ تحریکِ اسلامی نے عورتوں کو نہ صرف شرفِ انسانیت عطا کیا بلکہ علم کے دروازے ان پر کھول دیئے۔ اس صنف میں سے کئی حافظات و قاریات، محدثات و فقیہات، واعظات و عابدات اور شاعرات و ادیبات نمودار ہوئیں۔ بہت سی مؤرخ اور خوشنویس، معالج اور مدرس خواتین پیدا ہوئیں۔

یہ ایک عجیب تجربہ ہے کہ مغرب کی یورش سے پہلے کی مسلم عورت خواہ کتنی ہی تعلیم یافتہ ہو اور خواہ کسی بھی علم و فن کی خدمت کرے، اس میں آوارگی اور بے پردگی کے رجحانات اُبھرتے نہیں دیکھے گئے۔ خواتین نے بڑے بڑے وسیع حلقوں میں درس دیئے، مگر کیا مجال کہ پردہ کی کوئی حد ٹوٹے۔ آج یہ منظر عبرت ناک ہے کہ چار حرف پڑھتے ہی لڑکیاں گھر سے باہر کی طرف لپکتی ہیں۔ اور پردے سے بے پردگی کی طرف۔ اِس دَور کے نظریات اور تعلیمی سسٹم میں ایسی خرابیاں ہیں کہ ان پر تین حرف بھیجنے چاہئیں۔

۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی - ناشر: پروفیسر محمد منور صاحب ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی پاکستان - بڑے سائز کے ۷۵ صفحات - قیمت: ۱۸/- روپے

عزیز دوست ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کئی سال کی مسلسل کاوشوں کے بعد آج اقبالیات کے ماہر کی حیثیت سے صفِ اول کے اصحاب تحقیق میں سے ہیں۔ وقتاً فوقتاً وہ اقبال کے متعلق نئے نئے عنوانات پر نتائج کاوش اہلِ ذوق کے سامنے لاتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ تازہ کوشش بڑی قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے پوری طرح جائزہ لیا کہ ۱۹۸۵ء میں علامہ اقبال کی شخصیت و سوانح اور فن و فکر کے متعلق جو کچھ شائع ہوا ہے اس کا تذکرہ بھی ہو جائے اور خاص خاص خطوط اور مضامین اور دریافت شدہ مسودات کی بھی جھلک دکھا دی جائے۔ خاص طور پر علامہ اقبالؒ کے متعلق سوانحی اور تشریحاتی کتابیں نیز اقبال ہی کے متعلق جامعات کے امتحانی مقالے، مجلات و اخبارات کی خصوصی اشاعتیں اور کتابیاتِ اقبالؒ (۱۹۸۵ء) کا اشاریہ جیسی چیزوں کا ذریعہ حوالہ ہونے کی وجہ سے یہ مختصر جائزہ بڑی دستاویزی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

چند تصویریں از جناب خرم جاہ مراد، سابق ڈائریکٹر اسلامک فاؤنڈیشن لائسٹر انگلینڈ۔ ناشر: ادارہ مطبوعاتِ طلبہ، ۱-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔ خوبصورت سرورق، کاغذ طباعت عمدہ، قیمت ۶/- روپے۔ برائے تقسیم ۴ سو روپیہ سینکڑہ۔

احیائے اسلام کے لیے شگفتہ انداز میں نئے نئے عنوانات پر اور قارئین کے مختلف حلقوں کے لیے لکھنے والے حضرات بہت زیادہ نہیں ہیں۔ اور اس صف میں خرم جاہ مراد کا خاص مقام ہے۔ تعمیر اور میکانیات کا یہ انجینئر، انسانوں کے عقیدوں اور احساسات اور کردار کی تعمیر کے فن میں بھی دنیائے دل و نگاہ کا کامیاب انجینئر ثابت ہوا۔

"چند تصویریں" سیرت کے البم میں سے لی گئی ہیں۔ سیرت پاک کے واقعات، ان سے متعلق بعض آیات اور کہیں کہیں حضورؐ کے درخشاں ارشادات۔

الفاظ، عبارات، عنوانات، ترتیب دل نشیں!

نمک دان ڈائجسٹ مدیر اعلیٰ : عباس باوزیر ۔ دفتر ادارت : ۱۷۱ ۸ سی بلاک ۔ ۲ طارق روڈ پی ۔ ای ۔ سی ایچ ۔ ایس ، کراچی ۲۹ ۔ ضخامت : ۱۶۲ صفحات ۔ قیمت فی شمارہ دس روپے ۔ سالانہ بذریعہ رجسٹری -/۱۱۰ روپے ۔

ہلاکت آفرین ، پُر تشدد اور غم افزا دنیا میں انسانی جراحت کے پیمان کے لیے مرہم مزاح فراہم کرنے کے والے دو چار جرائد ہیں ۔ ان میں اضافہ باعث مسرت ہے ۔

ڈائجسٹ کو ڈائجسٹ بنانے کے لیے جس طرح متنوع ہلکے پھلکے مضامین اور واقعاتی قصّے درکار ہوتے ہیں وہ سب نمک دان میں ڈائجسٹ میں ہیں ۔ مزید ڈائجسٹی شان ان نسوانی تصاویر سے اُبھر آئی ہے جس میں دوسرے بہت سے رسالے بلکہ روزنامے بھی بہت آگے ہیں ۔

عباس باوزیر ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں ۔ وہ پہلے مزدور تحریک کا جھنڈا اُٹھا کر زخم کھانے نکلے تھے ، اب زخم ملے تو ان پر نمک چھڑکنے کا انتظام فرما رہے ہیں ۔ واہ ، مرداں چنیں کنند ۔ کون جانتا ہے کہ ایک انسان کے کتنے روپ ہوتے ہیں ۔

سنجتا ور لڑکا مؤلفہ : دلشاد کلانچوی ۔ ناشر : اکادمی سرائیکی ادب بہاولپور ۱۴ ۔ قیمت : -/۸ روپے ۔

کتاب کا پورا نام ہے — "سنجتا ور لڑکا ، نیک جوان ، آخری نبیؐ"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی جھلکیاں مختصر الفاظ اور سادہ زبان میں بچوں کے لیے دکھائی گئی ہیں ۔ عبارت سبز رنگ سے چھپی ہوئی ہے اور پھول دار حاشیہ سُرخ رنگ کا ہے ۔

لفظ "سنجتا ور" کے معنی اچھے ہیں ، اگر حضورؐ کے لیے اس کا استعمال جچتا نہیں ۔ رسولوں کا ذکر کرتے ہوئے الفاظ سوچ سمجھ کر استعمال کرنے چاہییں ۔

دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سیرت سے متعلق ہر جملہ اور ہر لفظ کسی واضح سند پر مبنی ہونا چاہیے ۔ خصوصاً بچوں کے کانوں میں کوئی ایسی حکایاتی باتیں نہیں ڈالنی چاہییں جو ثابت شدہ نہ ہوں ۔ اُمید ہے کہ اس کا اہتمام مؤلف نے ضرور کیا ہوگا ، بس کہیں کہیں شاید ادھر پوری توجہ نہ رہی ہو ۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ | از احمد منیر - ناشر: آتش فشاں پبلیکیشنز، ایبٹ روڈ - لاہور۔

صفحات: ۱۶۰ سفید کاغذ، اچھی طباعت، رنگین سرورق، قیمت: ۴۰/- روپے

مولانا (رحمۃ اللہ علیہ) کی وفات پر آتش فشاں نے ایک زوردار خاص نمبر نکالا - یہ کتاب اسی پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں خاص خوبی یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ کو فکری و سیاسی قیادت کے دائرے ہی دکھانے کے بجائے بڑے اہتمام سے خالص خاندانی ماحول میں دکھایا گیا ہے۔ بزرگوں اور عزیزوں کے ساتھ، بیگم صاحبہ اور بچوں کے ساتھ، مختلف خاندانی تقاریب میں ان کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے جو دوسری کتابوں میں اتنے زور سے نہیں پایا جاسکتا۔ یہ کتاب خود مولینا کے صاحبزادوں اور اقربا کے انٹرویوز اور گفتگوؤں اور یادداشتوں پر مبنی ہے۔ اس میں مولینا کے مختلف مدارج عمر کی تصویروں کے ساتھ خاندان کے متعدد افراد کی تصاویر جمع ہیں۔ تصویری لحاظ سے بھی یہ کتاب خاص ہے۔

محمد اکرم جوئیہ۔ ایڈووکیٹ کے پمفلٹ | محمد اکرم جوئیہ صاحب اسلام کے لیے انقلابی جذبہ رکھنے والے جواں سال ہم قلم ہیں جنہوں نے ان دنوں حسب ذیل پمفلٹ بطور خود چھپوائے ہیں:

۱- پاکستان میں نظام زکوٰۃ کی حیثیت اور اس کی ناکامی کے اسباب ۲- ہماری اقتصادی ناہمواریاں کیوں؟ اور ان کا علاج کیسے ہو؟ ۳- تجزیۂ انسداد رشوت ۴- ہمارے معاشرے میں بگاڑ کیوں؟ ۵- ہمارا معاشرہ بگٹٹ کدھر بھاگ رہا ہے؟

ان تحریروں میں بڑی بے چین روح کام کر رہی ہے اور موجودہ اضطراب انگیز حالات کا نہایت مفید تجزیہ سامنے آتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ غالباً یہ چیزیں جناب محمد اکرم صاحب نے مفت تقسیم کے لیے چھپوائی ہیں۔

موصوف کا پتہ: محمد اکرم جوئیہ ایڈووکیٹ۔ بی اے۔ ایل ایل بی۔ نصیر والا (میانوالی)

اقامتِ دین کا کام از شبیر احمد منظر قدوسی - ناشر: ادارہ صدائے سحر، بنگلور ۴ - کرناٹک، ہند - طباعت صاف، سرورق خوشنما - قیمت: ۴/- روپے

اس پمفلٹ کا پورا نام تو ہے "اقامتِ دین کا کام، کہاں اور کیسے ہو؟" مضمون اس کا یہ ہے کہ تحریکی دعوتی کام کا نہایت اہم دائرہ گھر ہے - گھر میں پورے زور سے کام ہونا چاہئے اس کام کے شعبے، اس کے موضوعات، اس کی راہیں اور اس سے متعلق مسائل اور پیچیدگیاں سب کو سامنے رکھ کر مؤلف نے بڑی خوبی سے اپنا مدعا پیش کیا ہے -

---

قافلۂ حق از ابن عبدالشکور - ناشر: مکتبہ ذکری، رام پور، یو پی - ۲۴۴۹۰۱ - انڈیا - پاکستان میں پتہ: اسلامی پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور - طباعت بہت نفیس - قیمت: ۱/۷۵

اس پمفلٹ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تحریک مجاہدین کے سربراہوں کی شہادت (۱۸۳۱ء) سے اقامتِ دین کے کام میں جو تعطل شروع ہوا وہ ایک سو دس برس بعد (۱۹۴۱ء) میں جماعت اسلامی کے قیام سے از سرِ نو شروع ہو گیا ہے - بعد ازاں سید مودودیؒ کی دعوت اور تعلیمات اور ابتدائی دور کے تحریکی حالات محفوظ کیے گئے ہیں -

---

مقدمۂ الحاق من جانب شعبہ پارلیمانی، جماعتِ اسلامی جموں و کشمیر -

اس پمفلٹ میں انڈیا سے ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کی سازش کو محور گفتگو بنا کر ظلم و جبر کی اس پالیسی کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے، جو جماعتِ اسلامی مقبوضہ جموں و کشمیر کے خلاف بھارتی اور کشمیری حکمرانوں نے مشترک طور پر اختیار کر رکھی ہے -

---

قرآن وحدیث کے نورانی احکام | شائع کردہ : فروغ اسلام فاؤنڈیشن ، آدم جی اسٹریٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۵ - راولپنڈی۔
۷۰ پیسے کی ڈاک کی ٹکٹیں بھیج کر حاصل کریں۔

اتحادِ ملت کے پانچ بنیادی اصول | از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۔ ناشر: ادارہ ترجمان القرآن، لاہور
صفحات : ۱۶ - ہدیہ: ۱/۲۵ - تبلیغی مقاصد کے لیے ۷۵/- روپے فی سینکڑہ۔

شیعہ حضرات کی اسلام سے بغاوت | از قاری اظہر ندیم ۔ ناشر: انجمن سپاہ صحابہ پاکستان۔
ملنے کا پتہ : عامر اکیڈمی ، ذیلدار روڈ : اچھرہ ، لاہور۔ قیمت: ۳/- روپے۔

سیرت ابوبکر صدیقؓ | از قلم محی الدین ایوبی ۔ ناشر: ادارۂ خیر و فلاح ، بلاک نمبر ۱۳ - فیڈرل بی ایریا - کراچی۔

رسولِ اکرمؐ کی حکمتِ انقلاب

از: سید اسعد گیلانی

○

- ○ رب العالمین نے سامانِ زیست کے ساتھ مقصودِ زیست بھی خود بتایا ہے۔
- ○ رحمۃ للعالمین، جو سراپا کمالات، سراپا رحمت اور سراپا ہدایت برائے عالمین ہیں۔
- ○ دعوتِ اسلامی کی اصولی بنیادیں، مزاجی خصوصیات اور عمومی خدوخال کیا ہیں؟
- ○ حضورؐ کا انقلاب آفریں اسلحہ، معجزہ کردار، معجزہ قرآن اور معجزہ کلام ہے۔
- ○ حضورؐ کی حکمتِ انقلاب، فرد کی تیاری، تنظیم کی تربیت، ہجرت کی مورچہ بندی اور جہاد میں مضمر ہے۔
- ○ متوازن اسلامی انقلابی معاشرہ سات اجتماعی ستونوں پر قائم ہے۔
- ○ اسلامی انقلاب سات حکمتوں پر مبنی ہے۔
- ○ رسولِ اکرمؐ کی حکمتِ انقلاب کی ۳۵ تدابیر کا مؤرخانہ تذکرہ ناقابلِ فراموش علمی بحث ہے۔
- ○ تاریخِ انسانی کا جامع ترین انقلاب جو واحد حقیقی انقلاب ہے۔

○

یہ کتاب ان حکمتوں کو زیرِ بحث لاتی ہے، جن پر عمل کر کے دنیا کے ہر معاشرے میں اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔

ضخامت: ۶۸۰ ○ نقشے ۴ ○ تصاویر متعدد

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ - رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور